نئی آواز
منتخب غزلیں
خالد حسن قادری

نئی آواز

خالد حسن قادری

نگارشات ○ میاں چیمبرز ○ 3 ٹمپل روڈ ○ لاہور

فون : 636-2412, 631-2968

نام کتاب ۔ نئی آواز
شاعر ۔ خالد حسن قادری
ناشر ۔ آصف جاوید
برائے نگارشات
3- ٹیمپل روڈ لاہور
مطبع ۔ المطبعۃ العربیہ لاہور
سال اشاعت۔ 1999ء
قیمت ۔ 150 روپے

فہرست

نمبر شمار	فہرست	صفحہ نمبر
۱	تقریظ	۷
۲	اجلال مختصر	۱۱
۳	یہ تیرا چہرا یہ میری آنکھیں	۱۳
۴	روشنی کے جلوس	۱۴
۵	ازل ہی تا بہ ابد ہے کوئی زماں نہ مکاں	۱۵
۶	لکھنوی کی نہ دہلوی کی طرف	۲۳
۷	پھر ہوا سنکی ہے پھر اودی گھٹا چھائی ہے	۲۶
۸	دوستی کی نہ دشمنی کی طرف	۲۸
۹	آپ ہی جان تمنا و تمنائی ہے	۳۱
۱۰	یہاں سارے کے سارے دیوتا ہیں	۳۳
۱۱	کسی کے زانوو سرلب و لب کی باتیں ہیں	۳۵
۱۲	زندگی ایک عجب موڑ پہ لے آئی ہے	۳۹
۱۳	نہ عشق ہی ہے ازل اور نہ زندگی ہے ازل	۴۲
۱۴	ہم سے کہتے ہو تم ہوا کیا ہے	۴۵

تقریظ

از

حضرت اعجاز صدیقی اکبر آبادی

خلف الرشید

حضرت علامہ سیماب اکبر آبادی

Established : 1930

The

SHAIR MOST POPULAR URDU MONTHLY_ شاعر

" QASRUL-ADAB "
Post Box. No. 4526, BOMBAY - 400 008.

1/

۲۲ر جون [illegible]ء

برادرِ مکرم خالد حسن قادری - سلام مسنون

غزلیں دیکھیں شائع نہ کیں گروہ کر دی تھیں - اُردو غزل اپنے فکر و اسلوب دو اعتبار سے
بہت بدل گئی ہے -

آپ کا
دعاگو [illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہے یہ اک خود احتسابی میں جگر کاوی کا فن
شاعری ورنہ بطور مشغلہ کچھ بھی نہیں

☆☆☆

اجلال مختصر

۱۳۹۵ھ

☆☆☆

یہ تیرا چہرہ یہ میری آنکھیں
نہ تیرا چہرہ نہ میری آنکھیں

نظر نظر خود فریبیاں ہیں
میں اپنا پرتو ہی دیکھتا ہوں
میں خود ہی مہتاب خود کتاں ہوں
ورائے اندیشہ و گماں ہوں
نہیں کہ مٹی ہوں اور ہوا ہوں
یہ سارے اسلوب ہیں بیاں ہیں

نہ تیرا چہرہ نہ میری آنکھیں
یہ تیرا چہرہ یہ میری آنکھیں

☆☆☆

روشنی کے جلوس

☆☆☆

تین غزلیں

پہلا جلوس

ازل ہی تا بہ ابد ہے کوئی زماں نہ مکاں
نہ عشق نام و نشاں ہے نہ حسن نام و نشاں

یہ خار و خس یہ گل و مل یہ رنگ و بو کا فسوں
ترے جمال کے پرتو ہیں یہ بہار و خزاں

ہے روح عصر بھی منت پذیر ذوق سفر
نہ منزلوں کا پتہ ہے نہ راستوں کا نشان

کسی کے شعلہ نم خوردہ کا فسانہ کیا
کوئی شرر بھی نہ اٹھا جہاں جہاں تھا دھواں

کہاں وہ برگ گل تر پر شبنمِ شاداب
وہ گرم گرم نفسِ وہ جبیں عرق افشاں

یہ حادثہ ہے کہ حادث ہے خود قدیم نہیں
یہ حادثات کا عالم ہے عالمِ امکاں

بفیضِ عشق مقدر ہے بار اخذ و قبول
کہ اعتبار سے پہلے یقین ہے نہ گماں[ع]

زمانہ شام و سحر پھر مری تلاش میں ہے
نہ کوئی مہدی موعود و عیسیٰ دوراں

ع اخذ و قبول بڑی ذمہ داری ہے اس لیے اسے بار سے تعبیر کیا ہے۔ عشق کے سبب غیر اکتسابی توفیق ودیعت کر دیتے ہیں صحیح اخذ و قبول کی اس توفیق کو اعتبار کہا ہے۔ عمل انسانی گمان و یقین کی منزل سے گزر کر صحیح بات کو چن لیتا ہے لیکن اس کا یہ عمل دراصل اس اعتبار کے سبب تھا جو بطور توفیق پہلے ہی عطا کر دیا گیا تھا ورنہ وہ گمان و یقین کی منزلوں سے گزر کر اس صحیح بات کو نہ پہنچتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ حسن انتخاب اور صحت فکر و نظر اس کا اپنا کارنامہ ہے؛ حالانکہ یہ محض توفیق ہے جس طرح ایک خشک بظاہر مردہ بیج میں شاداب و تناور و ثمر دار درخت بننے کی توفیق رکھدی ہے۔ اب وہ تمام منازل سے گزر کر اسی بار آوری تک پہنچے گا جو پہلے سے مقدر کر دی گئی ہے۔

ابھی نیا ہے یہ خوش مقدمِ بہار کا فن
نہ نرگسوں کے نظر ہے نہ سوسنوں کے زباں

مہک سے پیرہنِ ناز ہے گل و گلنار
کہ سر سے تابقدم ہیں محبتوں کے نشاں

ہے مصلحت کا تقاضہ خموشیوں کا نزاج
نہیں کہ مہر بلب ہوں یہاں کے غنچہ دہاں

ہے ازدحام کے باوصف ایسی تنہائی
کہ جیسے برسوں سے خالی ہوں بستیوں کے مکاں

☆☆☆

دوسرا جلوس

نہیں ہے اتنا بھی آساں ہدف سرِ یاراں
کہ ٹوٹ جاتے ہیں ٹکرا کے اس سے سنگ گراں

حیات غنچہ کی مثل انتظار کا عالم
جہان سود و زیاں میں نہ سود ہے نہ زیاں

ہے صرف روح تجدد جہان کہنہ و نو
نہ بستیوں کا پتہ ہے نہ مقبروں کا نشاں

میں اپنے علم کا خالق تو وہم کی مخلوق
دل و نگاہ کے رشتے نہ سود ہیں نہ زیاں

حیات منزلِ مقصود کی تلاش میں ہے
ہیں سخت ست قدم رہ روانِ عمرِ رواں

ملا کے خاک میں اکسیر کر دیا دل نے
نظر نظر سے ملی پھر نہ آگ تھی نہ دھواں

یہ انتخابِ محبت مری طلب کا شعور
ہے کون جان جہاں کون جانِ جاناناں

☆☆☆

تیسرا جلوس

انہیں سلیقہ تزئینِ نوبہار کہاں
یہ باغباں نہیں یہ ہیں چمن کے رودگراں

میں صاحبان یمین و شمال میں بھی نہیں
نہ اپنے کفر سے نالاں نہ زہد پر نازاں

یہ فرطِ حیرتِ مفرد کہ ہے خرد نہ جنوں
نہ چاک اپنا گریباں نہ دامن یزداں

ہے میرے قلب کے مانند تازہ و شفاف
نظیف و پاک و غمیں حسن درّہ بولاں

عطائے سادگی یا سمن غضب کی کشش
قبائے لالہ خوش رنگ، داغ و درد نہاں

ہے اعتبار وجودی بھی اعتبار آثار
یہ تیرا حسن نظر ہے کہ میرا حسن بیاں

رہ ستم میں نکالیں گے روشنی کے جلوس
چراغ ایک بھی رکھتے نہیں تہہ داماں

یہ قادرؔی کہ ہے الجھا میان ردّ و قبول
نہ کار ہوش و راں نے طریق درویشاں

☆☆☆

لکھنوی کی نہ دہلوی کی طرف
ہم زباں میں نہیں کسی کی طرف

ملکیت سے آدمی کی طرف
اک قدم اور آگہی کی طرف

شکوہ دست نارسا کس کو
کون دیکھے گا کب کسی کی طرف

ہم ترے شہر سے کہاں جائیں
موت کی سمت، زندگی کی طرف

ان سے اک بار مل گئی تھی نظر
ہم نے دیکھا نہ پھر کسی کی طرف

دور تاراجی چمن رخصت
دیکھنا اب نہ اک کلی کی طرف

کیوں چکا چوندھ ہو گئیں آنکھیں
حسن مائل ہے سادگی کی طرف

شور سے اڑ گیا دماغ اپنا
اب چلو شہر خامشی کی طرف

کون پیتا ہے کس کو پینی ہے
چشم مے گوں نہیں کسی کی طرف

دیر سے دھوپ میں کھڑا تھا یہاں
تم نے دیکھا نہ قادریؔ کی طرف

☆☆☆

پھر ہوا سنکی ہے پھر اودی گھٹا چھائی ہے
تم نے کیا آج بھی آنے کی قسم کھائی ہے

اب نہ وہ ہیں نہ شبِ ماہ نہ رسوائی ہے
اب تو ہم اور مسلسل غمِ تنہائی ہے

جب حسیں چوٹ کوئی دل نے نئی کھائی ہے
ہم کو لندن میں بھی کیا کیا تری یاد آئی ہے

تم بھی کہتے ہو کہ سودائی ہے سودائی ہے
میرا کیا اس میں تمہاری ہی تو رسوائی ہے

گردشِ دہر نے کجلا دیئے یادوں کے چراغ
دل مگر تیرا اسی طرح تمنائی ہے

ہے مقدر میں نہ ملنا نہ بُھلانا ممکن
اپنے اعمال کی کیا ہم نے سزا پائی ہے

جو نظر بزم میں اک بار بھی نیچی نہ ہوئی
خلوتِ شوق میں کس درجہ وہ شرمائی ہے

دل کے ہاتھوں نے تری یاد کا دامن تھاما
اب تجلی اسی مرکز پہ سمٹ آئی ہے

دوستی کی نہ دشمنی کی طرف
عشق مائل ہے سرکشی کی طرف

شہر تاریکیوں میں ڈوب گیا
کون چلتا ہے روشنی کی طرف

لاکھ ہو کائنات میں اسفل
نظر اٹھتی ہے آدمی کی طرف

کچھ نہ مقصود تھا نہ حاصل تھا
یوں ہی دیکھا کئے کسی کی طرف

کس کو ہے دعویٔ سخن فہمی
کون اِن ہوتا ہے قادریؔ کی طرف

ہم نے مانا کہ تم نہیں واقف
دیکھ لو یونہی اجنبی کی طرف

کون عیسی عہد سے جائے
پالؔ کی سمت یا متیؔ کی طرف

گفتگو کر کے ہم چلے آئے
تھا نہ روئے سخن کسی کی طرف

بام و در سب ہی جگمگا اٹھے
کوئی آیا تھا اِس گلی کی طرف

چند انگور کھا کے مست ہوئے
آپ مائل تھے میکشی کی طرف

قادریؔ پھر کہیں نظر نہ پڑا
جاتے دیکھا تھا اس گلی کی طرف

(لندن)

☆☆☆

آپ ہی جانِ تمناؤ تمنائی ہے
کون سمجھے گا؟ یہ انداز زلیخائی ہے

جل اٹھا آتش رخسار سے پیراہنِ گل
سانوری بھُر بھُری دھرتی سے بھی آنچ آئی ہے

اپنے کاندھوں پہ چلو اپنی صلیبیں لے کر
مقتلِ فکر میں پھر تازہ بہار آئی ہے

خون سے اپنے ہمیں لکھنا ہے دستورِ چمن
کیا ہے اس وقت مقدر قفس آرائی ہے

جس نے تپتے ہوئے صحرا کو لہو سے سینچا
اب گلستان میں وہ بیگانہ و سودائی ہے

سینہ اہلِ نظر مرقدِ افکار بنیں
باغباں کیا یہی طرز چمن آرائی ہے

خندہ غنچہ و تزئینِ چمن سب دھوکا
یہ خزاں ہے جو بہ اندازِ بہار آئی ہے

جل گیا آتش نمرود سے گلزارِ خلیل؎
اے خدا! جھوٹے خداؤں کی بھی بن آئی ہے

☆☆☆

؎ سقوط مشرق پاکستان

یہاں سارے کے سارے دیوتا ہیں
نہ انساں ہے نہ پربت ہے نہ گنگا

ہم اپنی جان کے ہیں آپ دشمن
کہاں کا ترک اور کیسا تلنگا !

نہ ہو گی باریابی پیش جاناں
مچایا ہے بہت یاروں نے دنگا

جناب رند بھولے ساری مستی
لگایا شیخ ؎ نے ایسا اڑنگا

بہت وہ پوچھتے تھے قادرؔی کو
خدا جانے کہاں ہو گا لفنگا

(لندن)

☆☆☆
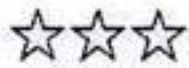
؎ عام طور پر شیخ کو سادہ لوح واعظ کو بے عمل اور رند کو آزاد غیر مصلحت پسند سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح رقیب کے واسطے اچھے جذبات کا اظہار نہیں کرتے نہ اسے خود اپنی طرح کا انسان سمجھتے ہیں۔ ان مستحکم اور مسلم مفروضات کے خلاف نئی آواز میں جگہ جگہ اشارے کیئے گئے ہیں۔

کسی کے زانو و سر لب بہ لب کی باتیں ہیں
ہمیں خبر نہیں جانے یہ کب کی باتیں ہیں

بھرے گھروں میں نہ تنہائیوں کی بات کرو
یہ فال نیک نہیں ہے غضب کی باتیں ہیں

اثر کو سمجھے نہیں مدعی دانش و فن !
سبب کو ڈھونڈتے ہیں بے سبب کی باتیں ہیں

چمن میں گھوم رہے ہیں خزاں کے سوداگر
تضاد صوت وصدا ان کے لب کی باتیں ہیں

نہ ہو گا خصمِ عدد دوست، سعی لا حاصل
عجم کے فقرے ہیں سارے عرب کی باتیں ہیں

ے خصمِ عدد۔ دشمن کا دشمن۔ عام طور پر کہتے ہیں دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔ دشمن کا دشمن دوست نہیں ہو سکتا۔ یہ سعی لا حاصل ہے وہ دوستی جس میں قدر مشترک دشمنی ہو کیا دوستی ہوئی۔ عالمی سطح پر سیاسی و نظریاتی اور محارباتی اتحاد جس میں مثبت اقدار کی جگہ منفی عوامل کار فرما ہوں ھباء منثور سے زیادہ نہیں۔

وہ نیم شب کو در دل پہ دستک نازک
حقیر بندہ ہوں میں اور یہ رب کی باتیں ہیں

رہے گا فرق من و تو وجود ہو کہ شہود
مرا سلیقہ شعور و ادب کی باتیں ہیں

یہ لطف خاص سر بزم ہم غریبوں پر
کسے خبر کہ یہ قہر و غضب کی باتیں ہیں

فقیر مست رموز شہی کو کیا جانے
حدیث دار و رسن اس کے ڈھب کی باتیں ہیں

حریم دل میں فلاں بن فلاں کا کام نہیں
ہے مدرسہ جہاں نام و نسب کی باتیں ہیں!

کسی کا نام ملاتے ہیں میرے نام کے ساتھ
نہیں ہے کچھ بھی حقیقت یہ سب کی باتیں ہیں

نہ رخ نہ عکس نہ آئینہ صرف وہم ہی وہم
اگر یہ باتیں ہیں تو کس غضب کی باتیں ہیں

وہ قادری کے لیے انتظار نیم شبی
تمہیں تو یاد نہ ہو گا یہ جب کی باتیں ہیں!

زندگی ایک عجب موڑ پہ لے آئی ہے
اب تو میں ہوں مرا غم ہے مری تنہائی ہے

نہ وہ اگلی سی محبت نہ وہ پہلی سی نظر
کیسے سمجھاؤں میں اس دل کو کہ تو آئی ہے

اب غم ہجر ہے دل کو نہ تمنائے وصال
ہو کا عالم سا ہے سناٹا ہے تنہائی ہے

دل تو فرقت کی کڑی دھوپ میں کمھلا بھی گیا
کن گلوں پر تری زلفوں کی گھٹا چھائی ہے

ہاں میں ہوں وعدہ شکن خود کو تم الزام نہ دو
میری تقدیر بنی بات بگاڑ آئی ہے

شہر خوباں میں ہمیں چاہنے والے ہیں بہت
کیا کریں پر تری فرقت ہمیں راس آئی ہے

ہیں کدھر لوگ کہاں ہیں وہ شناسا چہرے
اس بھری بزم میں تنہائی ہی تنہائی ہے

چاہتے کیا ہو اجالے میں بھٹکنے والو !
تیرگی بھی دل خورشید میں در آئی ہے

تیری یادوں سے مہکتے ہوئے لمحوں کی قسم
تیرا خالدؔ ترا عاشق ترا سودائی ہے

☆☆☆

نہ عشق ہی ہے ازل اور نہ زندگی ہے ازل
حقیقت ابدی مرگ، مرگ ہی ہے غزل

ہے تیرا غم بھی فسوں ساز غم کی دنیا میں
لگا ہو جس طرح چشمِ سیاہ میں کاجل

یہ احتجاج غلط بخشیوں پہ کس کی ہے
جلائی لالے نے اپنے وجود کی مشعل

بہت فریب دیئے دل کو رات بھر ہم نے
پیامِ زیست دمِ صبح تھا نہ پیکِ اجل

بلند بام فصیلوں پہ ڈالتا نہ کمند
خبر تھی کیا مجھے سارے ہی کانچ کے ہیں محل

بہا کے سیل رواں لے گیا خس و خاشاک
درست پر نہ ہوا رخنہ ہائے در کا خلل

وفور شوق میں کیف وصال عین فراق
نہ ساعتیں ہیں نہ گھڑیاں پہر یہاں ہیں نہ پل

ہے قتلِ نغمہ و رامش جو فتویٰ حاکم
میں تیرا ساز سنبھالوں تو چھیڑ میری غزل

مرے خیال کی مستی تری نظر کا فروغ
تری نگاہ سے روشن ہوئے دلوں کے کنول

ہو قادری کو روا کیسے مصلحت کوشی
نہیں ہے اس کی شکایت کہ دھر ہے مسجل ؎

لندن ۷ اپریل ۱۹۹۷ء

☆☆☆

؎ مُسجَل۔ عربی میں کہتے ہیں فعلناہ والدھر مُسجَل یعنی ہم نے یہ کام ایسے وقت میں کیا کہ ہر کام ہر شخص کے لیے جائز تھا۔ دنیا روا اور ناروا کی تمیز باقی نہ تھی۔

ہم سے کہتے ہو تم ہوا کیا ہے
خود نہیں دیکھتے کیا کیا ہے

ایک آتا ہے ایک جاتا ہے
کچھ خبر ہے یہ سلسلا کیا ہے

جان اپنی بچا کے کیا کرنا
بڑھ کے دے ہاتھ دیکھتا کیا ہے

سنگ ریزانِ عشق کے آگے
لشکر فیل ابرہہ کیا ہے

زندگی میں ہیں کاروبار بہت
نہ ہوا ایک عشق کا کیا ہے

سب سے یہ بار بار پوچھوں ہوں
کچھ بتاؤ مجھے ہوا کیا ہے

تو بھلا کیا تری حفاظت کیا
جاگنے والے جاگتا کیا ہے

کس نے بے زور کچھ دیا ہے کبھی
ہاتھ سے چھین مانگتا کیا ہے

قادرؔی کے ہیں سب کے سب دشمن
واعظ و رند و پیشوا کیا ہے

☆☆☆

عیش یک لمحہ سے ہے نالہ پیہم اچھا
تیرے ملنے کی خوشی ہے ترا غم اچھا

ان کے اعجاز مسیحائی میں کیا شک لیکن
ہوتے دیکھا ہے مریضوں کو بہت کم اچھا

وادی ظلم سے جب گزریں گے خاموش جلوس
پھر کفن کا مرے لہرائے گا پرچم اچھا

کون جنت کی بھلا فکر کرے ایسے ہیں
دھوپ اچھی ہے، ہوا اچھی ہے، موسم اچھا

میں بھی سب بھول گیا تم کو بھی کچھ یاد نہیں
ہم نے پیمان وفا باندھا تھا باہم اچھا

تیری پرسش نے بھی پھر دل میں کلھن پیدا کی
زخم پر یادوں کے تھا بھول کا مرہم اچھا

قادریؔ آج بھی ہو سکتا ہے بیمار ہی ہو
کیونکہ دیکھا ہے اسے ہم نے بہت کم اچھا

(لندن)

ان کی نظروں سے ملی دادِ فغاں سے پہلے
قلب بیدار دیا ہم کو زباں سے پہلے

اور بھی آئے ہیں عقّال یہاں مارکس کے بعد
جیسے گزرے ہیں حسیں نور جہاں سے پہلے

جھوٹ اور سچ کو تو پھر دیکھیں گے پہلے یہ کہیں
آپ نے بات سنی ہے یہ کہاں سے پہلے

اس کو بھی اک ترا انداز تغافل جانا
بات کا میری سمجھنا وہ بیاں سے پہلے

رند اور شیخ کی باتوں میں وہ کیسے الجھیں
جن کو ایقان ملا وہم و گماں سے پہلے

کیا توقع کبھی گلشن میں بہار آنے کی
بجلیاں کوندتی پھرتی ہیں خزاں سے پہلے

اب جو بچھڑیں تو خدا جانے ملیں یا نہ ملیں
سجدہ شکر تو کر ہی لیں اذاں سے پہلے

لندن۔ جنوری ۱۹۸۰ء

کہدیا ان سے مدعا کیا ہے
ہم نہیں جانتے دعا کیا ہے

بوئے گل ہے محیط صحن چمن
یہ فنا ہے تو پھر بقا کیا ہے

جان دی ہم نے ان کے قدموں میں
اور طاعت مرے خدا کیا ہے

کہہ دیا انسے مدعا کیا ہے   ہم نہیں جانتے دعا کیا ہے

بظاہر مدعا اور دعا میں ایطاء معلوم ہوتا ہے مگر نہیں ہے۔ دونوں لفظ بالکل الگ الگ معنی رکھتے ہیں اور معنی کا اتحاد کیا معنی اشتراک یا التباس بھی نہیں۔ غالب کی رباعی کا یہ شعر دیکھئے۔

غالب بہ سخن کست ہمسر نیست   ازنشہ ہوش پہچت اندر سر نیست

یہاں بھی ہمسر اور سر میں ایطائے جلی کا شبہ ہوتا ہے مگر مطلق نہیں کیونکہ دونوں لفظ الگ الگ معنی رکھتے ہیں۔

چاہ کر بھی مجھے مرے نہ ہوئے
اور تقدیرِ نارسا کیا ہے

سب ترے حسن کی ہیں تفسیریں
شاعری کیا ہے فلسفا کیا ہے

تجھ سے مل کے بھی دل بہل نہ سکا
کیا بتائیں ہمیں ہوا کیا ہے

آپ کہتے تو مان بھی جاتا
قادریؔ ایسا سر پھرا کیا ہے

☆☆☆

بخت عاشق، طالع معشوق و تقدیر رقیب
آ کے الجھی ہیں مری قسمت سے تقدیریں کئی

مرحبا وہ ہیبت طوق و سلاسل بھی گئی
لے کر ہم زنداں میں خود جاتے ہیں زنجیریں کئی

کس کو اب ناکامئ تدبیر کا الزام دیں
ہم نے خود لکھیں بہ لوح عرش تحریریں کئی

غیر فانی ہیں فضا میں پیکر صوت و صدا
گونجتی ہیں آج بھی مقتل میں تکبیریں کئی

لے کے آئی صبح نو زنداں میں پیغام حبیب
ایک خواب دلنشیں خوں گشتہ تعبیریں کئی

تیرے دیوانے کی ہیبت سے پگھل کر رہ گئیں
وہ جو آتی تھیں لٹکتی سر پہ شمشیریں کئی

ہر ادائے دل نشیں خوں گشتہ صد آرزو
برگ گل پر خون بلبل کی ہیں تحریریں کئی

کیا خبر دیوانہ مثل نکہت گل کیا ہوا
لے گئے زیر کفن زنداں سے زنجیریں کئی

قتل گل پر ماتم صبح بہاراں کیا کریں
یاں شعاع مہر سے ڈھلتی ہیں شمشیریں کئی

کچھ نہ ہم کہہ پائے جب اس نے کہا کیونکر جیئے
سوچ رکھی تھیں اگرچہ دل میں تقریریں کئی

آج ہم نے بے جھجک مقتل کو مقتل کہہ دیا
چاہتے تو ہم بھی کر سکتے تھے تعبیریں کئی

دور سے اک نظر ہی دیکھ لیا
یہ خوشی بھی بہت غنیمت ہے

اس طرف وہ نظر کرے تو سہی
سرسری بھی بہت غنیمت ہے

شکر فوز عظیم کے باوصف
نارسی بھی بہت غنیمت ہے

رنج و کرب و الم کی دنیا میں
یہ ہنسی بھی بہت غنیمت ہے

آج محرومیوں کے جنگل میں
خود کشی بھی بہت غنیمت ہے

کھو گیئے اس گلی میں ہم جا کے
بے خودی بھی بہت غنیمت ہے

زندگی کی سرنگ کے اس پار
روشنی بھی بہت غنیمت ہے

ان کی بیگانگی مطلق سے
بے رخی بھی بہت غنیمت ہے

ہے عداوت رقیب سے لیکن
آدمی بھی بہت غنیمت ہے

اس کی ابلہ فریبیوں کی قسم
قادرؔی بھی بہت غنیمت ہے

(لندن)

☆☆☆

بہت سہی غم فرقت پر اس قدر بھی نہیں
ہمارے حال کی تم کو ابھی خبر بھی نہیں

زمیں کے خشک لبوں تک تقاطر امطار
نہیں پہنچتا۔ کچھ ایسا تو گو سفر بھی نہیں

ترے بغیر مری زیست تیرے غم کی قسم
بہت ہے تلخ مگر اس سے کچھ مفر بھی نہیں

کہاں وہ چشم غلافی پہ گرم و تیز نفس
کہاں یہ اب کہ اچٹتی سی اک نظر بھی نہیں

ذرا سا کچھ تو پتہ ہو تلاش سے پہلے
وہ کیسے پہنچے جسے کچھ خبر عطر ؎ بھی نہیں

فضائے نور معنبر، ردائے عطر منیر
کچھ اس سے آگے خیالوں کی رہگذر بھی نہیں

تری نگاہ تغافل کہ تیری چشم کرم
کچھ اس سے بڑھ کے تو مفہوم خیر و شر بھی نہیں

؎ قدیم استاد سجّاد دہلوی کا شعر ہے:
بادِ صبا سے زلف معطر کی ہم تلک
مدت ہوئی کہ پہنچی نہیں کچھ خبر عطر
خبر کا تابع مہمل۔

بلائے جان عقابان تیز چنگ عصفور
مگر جو دیکھئے اس کو تو مشت پر بھی نہیں!

نہو نظام جہاں کا مداراس پہ مگر
فقیر گوشہ نشیں اتنا بے اثر بھی نہیں

کریدتے ہو جو اب بھولی بسری یادوں کو
دبا ہوا تہہ خاکستر اک شرر بھی نہیں

کریں حیات کی کم فرصتی کا کیا شکوہ
طویل لاکھ نہ ہو اتنی مختصر بھی نہیں

فقیہہِ شہر سے کہدو کہ ہم عوام الناس
ہیں بے خبر تو بہت اتنے بے خبر بھی نہیں

دوا نہیں تو دعا کرتے قادرؔی کے لیے
سفر طویل ہے اور کوئی ہم سفر بھی نہیں

(لندن)

☆☆☆

قتل کر کے ہم کو پچھتائے بہت
بھولنا چاہا تو یاد آئے بہت

یوں تو ننگے تھے سبھی حمام میں
دیکھ کر ہم کو ہی شرمائے بہت

آشیاں بندی گلوں سے کب ہوئی
خار و خس ہی اپنے کام آئے بہت

ماریئے شب خون اپنے شہر پر
دشمنوں کے گھر سے بھر پائے بہت

سادگی معصومیت نیچی نظر
کیا کہیں کیوں دل کو وہ بھائے بہت

جنکی سازش سے ہوئے ہم بے گھرے
یاد آتے ہیں وہ ہمسائے بہت

ہر دل میں رہتے ہو مگر آتے نہیں نظر
ہر جائی آپ کیوں ہیں اگر بے گھرے نہیں
منیر شکوہ آبادی

مطلع ثانی

سائے میں ہم آ کے پچھتائے بہت
دھوپ سے تھے گرم ترسائے بہت

اب اندھیرا گھپ ہی بہتر ہو تو ہو
اصل قد سے بڑھ چلے سائے بہت

لوٹ کر جب دوست گھر کو لے گئے
پوچھنے پھر آئے ہمسائے بہت

بات شاید ہی وہ مانیں آپ کی
قادریؔ صاحب ہیں خود رائے بہت

ہے شراب ناب گنگا جل نہیں کوثر نہیں
میکدہ کی راہ میں مسجد نہیں مندر نہیں

شوخی انداز رہن مستی ذوق نظر
ہم نہوں تو جلوہ کیسا دیدوبام و در نہیں

قربتیں کیا کیا بڑھی ہیں ان کے ذکر و فکر سے
حال گو ابتر سہی اب دل مگر مضطر نہیں

آدمی ہیں چند دن میں مر رہیں گے دیکھنا
ہم ہزاروں سال دنیا میں رہیں پتھر نہیں

یہ تری حسن ادا ہو یا مرا حسن نظر
دشت دل سے عالم امکاں مگر بڑھ کر نہیں

ہر طرف صیاد نے پھیلائی ہے افواہ سی
کس طرح سمجھایئے حال چمن ابتر نہیں

اک نظر وہ بھی اچٹتی سی جگر کے پار ہو
وہ نگاہ شرمگیں نشتر نہیں خنجر نہیں

دل خیال وصال کرتا ہے
آرزوئے محال کرتا ہے

رات کی بات کیا ہے جانے دو
کوئی اتنا ملال کرتا ہے

سارا گلشن اجڑ گیا پر دل
آشیاں کا ملال کرتا ہے

دل سے مجبور ہیں ہمیں ورنہ
کون کس کا خیال کرتا ہے

رند برخود غلط نہیں ہوتا؟
شیخ سے قیل و قال کرتا ہے!

جب ہو توہی ہمہ مآل فکر
کون فکر مآل کرتا ہے

فرصت یک نظر نہیں دل کو
عشق کیسے کمال کرتا ہے

خود ہی طالب ہے اور خود مطلوب
کون کس سے سوال کرتا ہے

تیری نظروں پہ کچھ نہیں موقوف
دل تو یونہیں ملال کرتا ہے

برملا رازِ خسرواں کہہ کر
قادریؔ بھی کمال کرتا ہے

☆☆☆

دل کو مل کر بھی بے کلی سی لگی
آج تو وہ بھی اجنبی سی لگی

سخت تاریک و سرد رات کے بعد
دھوپ بے حد مری مری سی لگی

نام پر تیرے جان سے گزرے
زندگی آج زندگی سی لگی

ہے ورائے دل و نگاہ جمال
ہر تجلی ہی عارضی سی لگی

دیکھ کر اس کو موند لیں آنکھیں
اپنی غفلت بھی آگہی سی لگی

اشتراکی کو حب جاہ نہیں!
بات بے حد ہی بے تکی سی لگی

رند اور شیخ سادہ دل دونوں
شخصیت ان کو کھوکلی سی لگی

دل نے سمجھا تھا جس کو حور و پری
آج تو وہ بھی آدمی سی لگی

اک نئی زندگی تھی چشم براہ
موت بھی کتنی عارضی سی لگی

ہر حسیں پر ازل سے حق ہے مرا
ہر حسیں زوجِ[1] قادری سی لگی

(لندن)

---

[1] زوج کو زوجہ کا مذکر نہیں سمجھنا چاہیے۔ اردو میں زوج کا لفظ صرف دینی اور مذہبی تحریروں میں بطور اصطلاح کے استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں جوڑے کے ہر فرد کو زوج کہتے ہیں بلا امتیاز تذکیر و تانیث۔ کلام پاک میں نباتات و حیوانات کے لیے بھی اسی طرح استعمال ہوا ہے۔

تین غزلیں

ہوا ہے آخر کار اپنی جان کا لیوا
وہ ایک لفظ کہ تجھ سے بھی جو ادا نہ ہوا

شہید ختم نہ ہوں گے صلیب گاہوں میں
یہ دور فتنہ آخر ہے اور میں عیسیٰ

ہے دور منزل تکمیل فطرت آدم
وہ حرف زیر لبی جو ابھی ادا نہ ہوا

نہ تیرے علم سے پہلے نہ میرے جہل کے بعد
دیار عشق میں مجھ سا بھی دوسرا نہ اٹھا

بہت ہیں خوب شیون و صفات کے پردے
تمہاری دید کا دل کو تو حوصلہ بھی نہ تھا

جزائے حرف جنوں عمر قید تنہائی
جو دیکھئے تو کچھ ایسا برا نہیں سودا

یہ کس تلاش میں پھرتے ہیں اپنے بیگانے
نقوش پا ہی تھے بکھرے ہوئے جدھر دیکھا

مطلع ثانی

حضور دوست فسانہ فراق کا کیسا
کہا کہا نہ کہا اور سنا سنا نہ سنا

حریم حسن میں غفلت ہے مرگ بے ہنگام
جسے پتا نہ رہا اس کا پھر پتا نہ رہا

زبان و لوح و قلم کو بھی اب نجات ملے
صلیب فکر پہ کیلے گئے کئی عیسیٰ

گراں ہے وقفہ یک لمحہ چہل سال کجا!
نہ وقت بے حد و غایت نہ وادی سینا ؎

نہ میں کہیں نہ کہیں تم یہ حال حال ہے کیا
پگھل گئے ہیں زمان و مکاں دی و فردا

حضور دوست بھی ہم کھوئے کھوئے سے ہی رہے
گزار دی ہے شب وصل بھی کبھی تنہا

؎ حضرت موسیٰ علیہ السلام وادی سینا میں اپنی امت کو لیے چالیس برس تک مشیت ایزدی سے گھومتے رہے۔ آج اسی وادی میں فلسطینی مسلمان بھی بے گھر پھر رہے ہیں۔ امت موسوی کے پاس وقت تھا لیکن اب زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں۔ اب حصول مقصد کے لیے وقفہ اک لمحہ بھی گراں ہے۔ چہل سال کجا!

وہ تو کہ تو نے کبھی میرے غم کو غم نہ کہا
وہ میں کہ میں نے ترے غم کو اصل جاں سمجھا

کہاں وہ جسم کی اک زندہ و جواں خوشبو
کہاں بہار کا پژمردہ بے مزا جھونکا

نہ باز آئے نہ آئیں گے تیرے دیوانے
ہزار طرح کا گو جبر ہم پہ کر دیکھا

مطلع ثالث

فریب حسن سمجھ کر نقاب رخ سر کا
ہلا نہ چشمک انجم سے آہنیں پردا ؎

؎ آہنیں پردا یعنی آئرن کرٹن۔ مارکس واسٹالن کا نظام
انجم = ستارہ - صیہونی پرچم کا نشان۔ آہنیں پردے کے عقب سے ہونے والی سیاسی عشوہ طرازیاں فریب حسن کی جلوہ سامانیوں کی طرح ہیں۔ نگاہ التفات خواہ صیہونیوں پر ہو یا اسلامیوں پر ان کی اپنی مساعی یا استحقاق کو دخل نہیں یہ صرف صاحب پردہ کے اپنے تنگ و محدود قومی و ملکی اور نسلی و سیاسی محرکات و مصالح پر مبنی ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ محض فریب مغالطہ اور زور وزور آہنیں پردہ بھی محض استعارہ ہے استعماریت کا خواہ وہ اشتراکی ہو یا سرمایہ دارانہ

عیاں ہوا ہے اسی سے جہان نامعلوم
بیان ہرزہ سرا سہو آدم[1] و حوا[1]

ؔ سہو آدم و حوا۔ میسحیت نے گناہ آدم اور گناہ اولیں کا نظریہ پھیلایا ہے۔ کلام پاک نے اس کی تردید کی ہے اور سہو آدم و حوا کو وہ عصیان قرار دیا جس میں انکا اپنا عزم وارادہ شامل نہ تھا۔ اضطراری کیفیت تھی۔ لم نجد لہ عزما اسی کیفیت کو سہو کہتے ہیں سہو جرم نہیں سہو گناہ میں بڑا فرق ہے۔

ہر ایک شخص یہاں تھا بزعم خود سقراط
مگر ہمیں نے پیا زہر کا بھرا پیالا[1]

گدائے گوشہ نشیں میرے سر کی قیمت کیا
لٹک رہی ہے مگر تیغ برسر دارا

یہ خود فریبی بادہ کشی تنگ ظرفی
تو جام زہر غم عشق پی شراب ہے کیا

---

[1] پیالہ میں ی کا تلفظ دونوں طرح سے نظم ہوا ہے۔

ارے مے نوش تو بھی آپ کو جلدی وہاں پہنچا
گدائے حسن کا کہتے ہیں تیرے آج پیالہ ہے
(مرزا جان طپش)

پیالہ مجھ آزاد کا بھر دے ساقی   نہیں میرا پیالہ ہوا چاہتا ہے
(ناسخ)

مطلع رابع

جمال حور و جلال شہی سے بے پروا
جو تیرے زانو پہ سر رکھ کے بار ہا سویا

یہ چاٹ جائے گا ظالم تجھے بھی میری طرح
یہ دور جور نہاں اور یہ ظلم بے پروا

نظارہ جبر تمنا ہے اختیار کہاں
نظر اٹھا کے نہ دیکھیں یہ بار ہا سوچا

صدائے شہر فسوں ہے نظر نہ در سے ہٹا
وہ مثل سنگ ہوا جس نے لوٹ کر دیکھا

رضائے دوست میں گم بحث خیر و شر سے الگ
ہمیں نہ کچھ غم دنیا نہ کچھ سر عقبیٰ

کبھی تو قادریؔ نے لب پہ لب رکھے ہوتے
ہزار رند نہ ہو اتنا پارسا بھی نہ تھا

(لندن)

☆☆☆

مدعی لایق گفتار نہیں ہے کوئی
سر ہیں شایستہ تلوار نہیں ہے کوئی

ان کے کوچہ میں ہے کیوں موت کا سا سناٹا
ہم نہیں تو پس دیوار نہیں ہے کوئی

قم باذنی کا چلو ہم ہی لگا دیں نعرہ
آج مقتل میں سردار نہیں ہے کوئی

خوئے تسلیم کہیں بانی بیداد نہ ہو
سر تو دینے میں ہمیں عار نہیں ہے کوئی

سامنے آ کے قسم کھاتے ہوئے ڈرتے ہیں
دیکھ تو لو پس دیوار نہیں ہے کوئی

شرف و آبروئے عشق پہ کیا بیت گئی
آج رسوا سر بازار نہیں ہے کوئی

کہنے والے تو کہا کرتے ہیں کہنے دیجئے
بات سن لینے میں تو عار نہیں ہے کوئی

اٹھ کے ہم دیر و حرم کو تو نہیں جائیں گے
سر کے ٹکرانے کو دیوار نہیں ہے کوئی

مفتی شہر و فقیہہ حرم و پیر مغاں
لوگو! ان میں تو سمجھدار نہیں ہے کوئی

قادریؔ اپنے لیے ہم ہی مصیبت بنجائیں
دیر سے درپے آزار نہیں ہے کوئی

۵ جولائی ۱۹۷۸
(دراثنائے سفر از کرنال تا دہلی نوشتہ شد)

☆☆☆

وہ فیض عشق سے بھی دور دور گزرے ہیں
حضور دوست بھی جو بے حضور گزرے ہیں

صلہ عبادت یک عمر کا ہے مستی عشق
نظر سے اپنی بھی حور و قصور گزرے ہیں

طلوع صبح درخشاں کہاں ہے اول شب
اندھیری رات میں لمحات نور گزرے ہیں

کھنڈر جلے ہوئے اپنے تو گھر نہیں لیکن
ادھر سے گزرے ہیں ہم اور ضرور گزرے ہیں

بزعم فکر و نظر دار و گیر منزل سے
قصور وار ہیں جو بے قصور گزرے ہیں

ترے خیال کے صدقے کہ تیرے دیوانے
غم جہاں سے بہت دور دور گزرے ہیں

دیار سیمبراں یا جہان حور جناں
جدھر سے گزرے ہیں ہم ناصبور گزرے ہیں

ہر انقلاب نقیب جمود نو ہی سہی
نظر سے معنی بین السطور گزرے ہیں

کہاں ہے دوست، محبت ہے کیا، رقیب ہے کون
فریب نفس ہے دھوکے ضرور گزرے ہیں

وہ بے قراری قربت، قرار مہجوری
کہیں یہ کیسے کہ ہم ان سے دور گزرے ہیں

ترا خیال بھی جب دل پہ بارسا گزرا
کچھ ایسے لمحے بھی ہم پر ضرور گزرے ہیں

بس ایک بار تجھے زندگی میں چاہا تھا
کہیں یہ کیسے کہ ہم بے قصور گزرے ہیں

ہوا ہے باعث تزئین کائنات جنوں
وہ بے شعور ہیں جو باشعور گزرے ہیں

جو تیری سمت نظر بھر کے دیکھ بھی نہ سکے
جلو میں اپنے لیے برق طور گزرے ہیں

تجھے خبر ہے کہ پھرتا ہے اجنبی سا کوئی
لب اس کے چرچے تو نزدیک و دور گزرے ہیں

وہ چند لمحے کہ جب دل نے دل کی بات سنی
وہ ماورائے سنین و شہور گزرے ہیں

ترے بغیر بھی جیتے ہیں تیرے دیوانے
یہ دلب عشق کہ تجھ سے بھی دور گزرے ہیں

تمہاری یاد ہی آئی ہے جب بھی نظروں سے
ہجوم سیمتن کانپور گزرے ہیں

وہی ہیں حاصل یک عمر جاوداں خالد
وہ چند لمحے جو ان کے حضور گزرے ہیں

(در کان پور نوشتہ شد)

☆☆☆
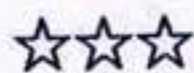
کیا کہیں کس کی چاہ میں گزرا
وقت سب اشتباہ میں گزرا

دل فصیل فراق میں رہ کر
آرزو کی پناہ میں گزرا

اقتباس تجلیات کا وقت
نظر گاہ گاہ میں گزرا

زندگی کیا ہے وقفہ راحت
جو تری جلوہ گاہ میں گزرا

تیرا غم تھا حصار شہر پناہ
وقت شہر پناہ میں گزرا

میکدہ میں ہو زندہ داری شب
دن تو سب خانقاہ میں گزرا

کیا خبر دیر اور حرم ہیں کدھر
وقت سب تیری راہ میں گزرا

رند کے ساتھ قادریؔ کا دن
حجت خواہ مخواہ میں گزرا

لندن۔ ۲۳ نومبر ۱۹۷۸ء

☆☆☆

شہر خوباں میں یہی کہرام ہے
قاتلوں کا آج قتل عام ہے

ہم کو اب تک مانگنا آتا نہیں
بے طلب دنیا انھیں کا کام ہے

کس سے کہئے جاگتی آنکھوں کے خواب
اب یہاں ہر شب شب ماخام؎ ہے

؎ ماخام پشتو کا لفظ روہیل کھنڈی اردو میں گھریلو زبان کا عام لفظ ہے۔ عورتیں جب لڑکیوں کو کوستی ہے تو کہتی ہیں "تو ماخام کی حریان رہ جائے"۔ مرادیہ کہ تجھے شب عروسی نصیب نہ ہو۔

جس کو سب کہتے ہیں جنگ زرگری
اشتراکیت کا عرف عام ہے

سامریت[1] سے خدا ملتا نہیں
زر پرستوں کا خیال خام ہے

ہم نے مڑ کے ان کو دیکھا ایک بار
عاشقی ہم پر فقط الزام ہے

اپنی حد سے بڑھ کے پہنچے گی کہاں
عقل پختہ کار کتنی خام ہے

وہ جو بیٹھے ہیں وہاں مجذوب سے
قادری صاحب انہیں کا نام ہے

---

[1] سامریت۔ جادوگری نہیں زر پرستی۔ سامری غالباً تاریخ میں پہلا شخص تھا جس نے عجل طلائی کی پرستش کرادی۔ اس لیے زر پرستی اور سرمایہ داری کو مترادف سمجھا گیا ہے۔

ان کے غم ان کی محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
ہر نفس میرا بجز صرف دعا کچھ بھی نہیں

حسن خود اپنی تمناؤں میں بن جاتا ہے دل
ورنہ یہ قلب و نظر کا سلسلا کچھ بھی نہیں

کم سے کم اک سعی پیہم کی علامت ہی سہی
ہم نے یہ مانا کہ طوفاں میں دیا کچھ بھی نہیں

میرے غم کی سوز و مستی میرے دل کا جذب و شوق
ورنہ رخ پر غازہ رنگ حیا کچھ بھی نہیں

اک طلب بے مدعا اک آرزو بے اقتضاء
آپ نے کیا سمجھا میں نے تو کہا کچھ بھی نہیں

چاند سے حسن ملیح یار کی تشبیہہ کیا
ہم نے دیکھا ہے اسے بھی بارہا کچھ بھی نہیں

عقل کی بالیدگی کو جذب و مستی چاہیے
اشتراکیت میں باتوں کے سوا کچھ بھی نہیں

آرزو وصل و رنج ہجر کچھ باقی نہیں
دل میں اب موہوم یادوں کے سوا کچھ بھی نہیں

مصدر مضطر کا ہے جو صادر لازم میں ہے
ابتدا ہی انتہا ہے انتہا کچھ بھی نہیں

قید باد صبح کو کیا ہیں حبابوں کے قفس
بندش لب وہم باطل کے سوا کچھ بھی نہیں

جذب پیہم سے کھنچا جاتا ہے اپنے آپ دل
سچ تو یوں ہی ہے جمالِ دلربا کچھ بھی نہیں

عقل و جدان و دروں بینی سے بچاتی ہے عشق
خود دوا ہے درد، درد لا دوا کچھ بھی نہیں

بار ہا فوجِ ستم پرور نے لوٹا تھا چمن
اب وہ سب ماہی مراتب بر ہوا کچھ بھی نہیں

دل کو عادت ہے ملالِ بے سبب کی قادریؔ
ورنہ ان نیچی نگاہوں نے کہا کچھ بھی نہیں

لندن۔ ۳۰ مارچ ۱۹۸۱ء

بجا سرمایہ و محنت کی منطق
مگر چَخ چَخ کی پروا کس نے کی ہے
حضوری تا حضوری یک نفس ہے
یہاں برزخ کی پروا کس نے کی ہے
اگر ہو فقر و فاقہ عین سیری
تو پھر مطبخ کی پروا کس نے کی ہے
جہاں خرط[1] القتاد[2] اک زندگی ہو
وہاں مسلخ کی پروا کس نے کی ہے

☆☆☆

---

[1] خرط۔ ٹہنی سے پتوں کو ہاتھ سے سونت کر اتارنا۔
[2] قتاد۔ سخت درخت ہے جس کے کانٹے سوئی کی طرح ہوتے ہیں۔
خرط القتاد۔ بڑی مشقت اور تکلیف کا کام جس کے مقابلہ میں قتاد کے کانٹوں کو ہاتھ سے سونت کر اتارنا زیادہ آسان ہو۔

تھا شب غم میں کچھ اس طرح ہجوم آلام
جس طرح قلب نبی پر ہو نزول الہام

زندگی دور مسلسل ہے سفر ہے نہ قیام
وقت کے نقش کف پا ہیں نہ یہ صبح نہ شام

ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کا سکوں خیز الم
کون سمجھے تری شائستہ نگاہی کا پیام

کیا ہیں باوصف قیامت گری جز مشت غبار
بھول جاتے ہیں بگولے بھی خود اپنا انجام

خود تراشیدہ خداؤں کی پرستش کب تک
عقل آوارہ ہے مخلوق ہزاراں اوہام

خود الجھتا رہا میرا دل تاویل پسند
سخن زیر لبی میں تو نہ تھا کچھ ابہام

ق

وہ مچلتی ہوئی آنکھیں وہ چھلکتے ہوئے جام
وہ بہکتی ہوئی نظریں وہ بکھرتے ہوئے دام

وہ دمکتے ہوئے عارض وہ سمٹتی سی شفق
وہ سنورتے ہوئے گیسو وہ نکھرتی ہوئی شام

ہم بکھر جاتے ہیں خود ریت کے ذروں کی طرح
سر کے ٹکرانے کو درکار نہیں ہیں اصنام

حل اشکال کو درکار ہے پیمانہ نور ؎
برق رفتار ہے عشق عقل ہے آہستہ خرام

فکر نو قادری پابند سلاسل نہ ہوئی
کس نے ڈالی ہے سبک سیر غزالوں کے زمام

مارچ-اپریل ۱۹۸۱ء
لندن

؎ پیمانہ نور۔ علاوہ اور تعبیرات Light Year کا مفہوم بھی رکھتا ہے اور اتقوا فراستہ المومن فانہ ینظیر بنور اللہ کی طرف بھی اشارہ ہے (مومن کی فراست سے ڈرو کیوں کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھ لیتا ہے)۔

عاری تجدد سے انقلابی   سارا تفلسف درسی کتابی
میں بدعتی ہوں تو رجعتی ہے   میں انقلابی اور تو وہابی
میں مست طاعت تو مست طاقت   میں بھی شرابی تو بھی شرابی
میں بھی مقلد تو بھی مقلد   تو مارکسی ہے میں بوترابی
وہ مولوی ہوں یا اشتراکی   دونون کا سارا مذہب رکابی
مست ازل ہیں بے جام و صہبا   ہم سے پرانے عادی شرابی
سارے ملائک حیرت فروشاں   تیرے گدا کی عالی جنابی
کچھ تو بتائے تعمیر نو ہو   کتنی ہوئی ہے دل کی خرابی
لمس بدن کی پاکیزہ حسرت   عصمت پناہی عفت مآبی

تم نے بھی پرکھا کیا قادری کو
ہم نے نہ پائی کوئی خرابی

لندن ۱۵ اپریل ۱۹۸۱ء

وہ جادو تیرے حسن کا تھا جو سات سمندر پار گیا
فرعون کے دعوے غرق ہوئے اور موسیٰ عمراں ہار گیا

کچھ کام نہ آیا جاہ و حشم سب تیغ بکف صف آرا تھے
اک برہنہ سر اک برہنہ پا جس رہ سے گیا للکار گیا

عام طور پر اس کا تلفظ برہنہ ہے یعنی ہ کے سکون سے۔ شعر میں ہ کے زبر سے نظم ہوا ہے۔ جو عام نہیں مگر غلط بھی نہیں۔ البتہ روش عام کے خلاف ہے اور فصیح نہیں۔ غیاث اللغات میں ہے۔ "برہنہ بفتح اول و ثانی و سکون ہا۔ ترجمہ عریاں۔ و فتح اول و سکون ثانی و فتح ہا نیز آمدہ"۔

دیوانہ کو دیوانہ سمجھے وہ اصل میں خود دیوانہ ہے
سرمست مے عشق جاناں ہشیار رہا ہشیار گیا

نیزوں پہ ہیں کچھ سر آویزاں وہ ناصیہ فرسا اب ہیں کہاں
باقی نہیں طبل و تیغ و علم سرکار مٹی دربار گیا

اب بلبل و گلچیں فارغ ہیں کیا دورِ خزاں کی برکت ہے
پتوں کا بکھیڑا پاک ہوا اور پھولوں کا انبار گیا

سب زاہد و شیخ و رند اپنے آرام کدوں کو لوٹ گئے
تھا صرف وہ درویش حق گو جو اٹھ کے سوئے دار گیا

ذہنوں پہ دھند لکا چھلیا ہے ٹھٹھری ہوئی سی ہے ساری فضا
تجدید کے سارے دعوؤں کو تقلید کا پالا مار گیا

میں قادری ہوں بس ان کی تو مجوب نگاہی کے قرباں
اک ہارنے والا جیت گیا اک جیتنے والا ہار گیا

لندن ۷ ااپریل ۱۹۸۱ء

عدو سے ہم کو کوئی کد نہیں ہے
کسی کے چاہنے کی حد نہیں ہے

اٹھ آتا ہے ان کے نام پر جی
مگر پہلی سی شدومد نہیں ہے

ہے قتل نفس بھی جیو ہتیا یاں
یہ دیوار صنم برگد نہیں ہے

برگد کے درخت کے نیچے مہاتما بدھ کو گیان ہوا تھا۔

ہے مثل عقل گو وجدان محدود
مگر اس حد کی بھی کچھ حد نہیں ہے

جسے چاہا اسے توفیق غم دی
یہ کچھ میراث اب و جد نہیں ہے

ہیں قدریں مشترک، سب اتفاقی
خیالوں کی کوئی سرحد نہیں ہے

تمام علوم و حکمت کا سرچشمہ معارف الہیہ ہیں۔ راس الحکمۃ مخافۃ اللہ رب تبارک و تعالیٰ نے انبیاء کو ان علوم سے سرفراز فرمایا اور انکے ذریعے یہ علوم درجہ بدرجہ شائع و عام ہوئے۔ اس لیے یہ حکم لگانا کہ فلاں نے فلاں سے اخذ کیا درست نہیں۔ مغرب کے یہودی اور عیسائی مبلغین علماء نے بڑی زیرکی سے تدلیس اور تلبیس کا جال سائنس، فلسفہ، تحقیق اور تنقید کے نام پر پھیلایا ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ مسلمانوں نے تمام علوم و شعائر دوسرے مذاہب سے التقاط کیے ہیں۔ چند سطحی مشابہتوں کو سامنے رکھ کر فیصلے صادر کر دیے ہیں۔ مشرق کے مسلمان نام نہاد جدید محققین نے آمنا صدقنا کہہ کر انہیں قبول کر لیا ہے اور اپنی سادگی میں ان یہودی اور عیسائی علماء کے آلہ کار بن گئے ہیں۔ فخر کے ساتھ ان کے کذب و افترا سے استدلال کرتے ہیں اور حوالے دیتے ہیں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام زیادہ تر عیسائی مبلغین اور یہودی و صیہونی مستشرقین کے مقالوں سے مرتب کی گئی ہیں جو دروغ باغیوں اور افترا پردازیوں کے شاہکار ہیں۔ مثلاً یہ کہ سلسلہ نقشبندیہ پر مہایانا بدھ مت کا اثر ہے حالانکہ حال یہ ہے کہ مقالہ نویس کو نہ تو یہ علم ہے کہ بدھ مت کیا ہے نہ یہ پتہ کہ مہایانا سے مدعا کیا نہ یہ خبر کہ سلسلہ نقشبندیہ کسے کہتے ہیں۔ یا حضرت ابراہیم بن ادھم کے واقعات کو مہاتما بدھ کی زندگی سے اخذ کر کے ڈھال لیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ یہ مطلق بے سروپا باتیں ہیں اور مغرب کی ان لغویات پر یقین رکھنا ذہنی افلاس کا مظہر ہے اگر تہذیبی عناصر اور مذہبی شعائر میں کچھ قدریں مشترک ہوں تو یہ محض اتفاق ہو سکتا ہے اس کے سوا مطلق کچھ نہیں۔

ترے مستوں کا سکر صحو ¹ آراء
کوئی منصور یا سرمد نہیں ہے

ہے راضی بر رضا رند خدامست
یہاں زاہد کی ردوکد نہیں ہے

زیاں کیا قادرؔی کی دوستی میں
ہے وہ بدنام لیکن بد نہیں ہے

لندن ۱۴ اپریل ۱۹۸۱ء

☆☆☆

---

¹ سکر اور صحو دو متضاد کیفیتیں ہیں۔ دونوں بیک وقت جمع نہیں ہوتیں۔ سکر جذب وبیخودی۔ صحو ہشیاری وباخبری۔ لیکن خدامستوں کی سکر و مستی میں غفلت و بے ہوشی کا دخل نہیں ہوتا۔ باطن وہ ہوشیار و بیدار رہتے ہیں۔ خدامستوں کی اسی کیفیت ہشیاری کو جو بظاہر مستی و بے خودی محسوس ہوتی ہے سکر صحو آراء کہا ہے جس کا اندازہ سرمد و منصور کے احوال سے نہیں ہو سکتا۔

دیکھ کر کس درجہ حیرانی ہوئی
تھی وہ صورت جانی پہچانی ہوئی

آپ کی باتوں سے حیرانی ہوئی
ہم کو خود کہہ کر پشیمانی ہوئی

ایک نامعقول شک کا کیا کریں
آپ کی تو بات ہے مانی ہوئی

بے خودی میں جانے کیا کچھ کہہ دیا
شہر بھر میں مرثیہ خوانی ہوئی

آسماں بے نور تاروں سے بھرا
کس غضب کی جلوہ ارزانی ہوئی

فرق بعد و قرب کچھ باقی نہیں
آئینے کو کیسی حیرانی ہوئی

قادریؔ صاحب تمہاری شاعری
اک نئے انداز کی بانی ہوئی

لندن ۱۶ جنوری ۱۹۸۷ء

☆☆☆

ہمیں نے ڈالی تھی دنیا میں عاشقی کی طرح
ستائے پھرتے ہیں اب یاں کسی نبی کی طرح

تمہاری سمت نظر بھر کے بھی نہیں دیکھا
گزر گئے ہیں دبے پاؤں اجنبی کی طرح

یہ حسن و عشق ازل اور ابد کے پیمانے
جہان کون و مکاں ریت کی گھڑی کی طرح

پرائی آگ میں ہم جل کے خود بھسم ہو لیں
کوئی تو رسم بھی دنیا میں ہو ستی کی طرح

وہ یاد آتا ہے رہ رہ کے کیوں خدا جانے
جو ساری عمر رہا گھر میں اجنبی کی طرح

یہ انتخاب مراعات بھی ہے محرومی
تمہاری ہاں سے پڑی ہے یہاں نفی کی طرح

ے کہتے ہیں کہ مکمل آزادی ہے انتخاب کی۔ جو حاضر و موجود ہے یا سامنے ہے اس میں سے جو چاہو چن لو۔ آزاد ہو۔ مراعات مقرر، اختیارات کی فہرست موجود، انتخاب کی مکمل آزادی۔ یہ انتخاب مراعات ہے اور یہی محرومی کی بنیاد ہے۔ سیاست میں نظریات میں، معاشرت میں، معیشت میں، ہر جگہ ہاں کے پردے میں نہیں ختل الصیاد کی طرح موجود ہے (ختل الصیاد یعنی شکاری کا ایسے دبے پاؤں پیچھا کرنا کہ شکار کو آہٹ نہ پہنچے)

ترا خیال ہمیشہ ہمارے ساتھ رہا
اندھیری رات میں تاروں کی روشنی کی طرح

بدن کا لمس جواں جسم کی حسیں خوشبو
ہوس کے شہر میں ہے کیف آگہی کی طرح

قدم نہ ٹھٹکے نگاہیں گریز پا نہ ہوئیں
تمہارا نام سنا ہم نے اجنبی کی طرح

دروغ مصلحت آمیز کو نہ اپناؤ
جہاں میں زیست کرو تم بھی قادریؔ کی طرح

تم بھی رسوا ہوئے چھپانے میں
بات کچھ بھی نہ تھی فسانے میں

رہ پڑے ہم شراب خانے میں
دیر لگتی تھی آنے جانے میں

دل پہ جو بیتنی تھی بیت گئی
کیا گیا ان کا مسکرانے میں

آشیاں سے قفس میں جا کے رہے
ہے کشش کچھ تو آب و دانے میں

دل زدوں کے سکون کی صورت
ہے قفس میں نہ آشیانے میں

قادرؔی ایک بار گر روٹھا
پھر نہ آئے گا وہ منانے میں

لندن ۲۹ جون ۷۷ ۱۹

☆☆☆

لوگ سمجھے میکدہ آشام ہے
دیر سے ہاتھوں میں خالی جام ہے

کس نے پھر قاتل سے مانگا خوں بہا
کیوں گلی میں شور بے ہنگام ہے

پیکر ساقی و میکش گرد ہیں
میکدہ بت خانہ اوہام ہے

شعر اپنے بھی غنیمت ہیں میاں
اس کے آگے بس خدا کا نام ہے

بند ہیں سب صاحب بست و کشاد
سچ تو یہ ہے اب بہت آرام ہے

عقل کل ہونے سے کچھ ہوتا نہیں
آدمیت آدمی کا نام ہے!

اشتراکی کم نہیں رجعت پسند
شہر میں ملاعبث بدنام ہے

قادرؔی سے بھی تو مل کر دیکھیے
بد نہیں ہے جس قدر بدنام ہے

لندن-جولائی ۱۹۷۷ء

☆☆☆

ہمیں بھی چاہا تھا تم نے کبھی کسی کی طرح
اگرچہ ملتے ہیں اب دونوں اجنبی کی طرح

ہر ایک حال میں دیوانہ پن نہیں اچھا
کبھی تو بات کرو ہم سے آدمی کی طرح

نظر اٹھا کے بھی تم نے کبھی نہیں دیکھا
کھڑے رہے ہیں بہت دیر اجنبی کی طرح

مرا وجود سرراہ ہے سایہ دیوار
ترا جمال ہے جاڑوں کی چاندنی کی طرح

ترے فراق میں جینا بھی راس آئے گا
گھپا میں بیٹھے ہیں سب تج کے ہم رشی کی طرح

وہ تیرے گرم نفس کی عفیف و پاک مہک
ولوں پہ چھائی ہے شبنم کی تازگی کی طرح

یہ کیا ہوا نہیں پہچانتیں مجھے گلیاں
میں اپنے شہر میں پھرتا ہوں اجنبی کی طرح

جہاں سے جاتی رہے رسم مصلحت کوشی
اگر ہوں سر پھرے دو چار قادریؔ کی طرح

لندن۔ جنوری ۱۹۷۷ء

ہم کو شرم آتی ہے اب کہتے ہوئے
مدتیں گزریں ستم سہتے ہوئے

نام سے بھی تو کوئی واقف نہیں
عمر گزری ہے جہاں رہتے ہوئے

خول میں ریشم کے کیڑے کی طرح
کیا یونہیں مر جائیں غم سہتے ہوئے

دیس میں کیا جائیں اب تو کٹ گئی
زندگی پردیس میں رہتے ہوئے

قادریؔ کی بات بھی سن لو کبھی
اک زمانہ ہو گیا کہتے ہوئے

لندن۔ نومبر ۱۹۷۸ء

☆☆☆

مرحلے کچھ اور ہیں یاں بعد و قرب دل نہیں
مجھ کو کچھ آساں نہیں ہے ان کو کچھ مشکل نہیں

جلوہ ہم رنگ نظر ہے فرق غیریت کہاں
سب کے سب مقتول ہیں یاں پر کوئی قاتل نہیں

شہر مہ رویاں بدامان کتاں بھی ہم رہے
ہے یہ محض ان کا تصرف ہم کسی قابل نہیں

شانِ ہر لحظہ نئی ہے جلوہ مہمیز نظر
عشق بھی ذوقِ سفر ہے حسن بھی منزل نہیں

اک نظر بھر ورثۂ حسن ازل لینے کو ہیں
آپ داتا ہیں کہاں کے ہم کوئی سائل نہیں

کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَان (سورۂ رحمٰن)

ے آپ کا حسن حسنِ ازلی کا ہی پرتو ہے اور حسنِ ازلی پر ہمارا ازلی حق ہے اس لیے آپ کا نقاب اٹھانا۔ جلوہ گستری کرنا اور فیض عام کرنا کوئی احسان نہیں اور ہمارا اس کا طالب ہونا ہمیں گدا اور آپ کو داتا نہیں بناتا۔ ہم تو خود اپنی ملک میں سے ذرا سا لینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ صرف نظر بھر۔ آپ کا احسان و کرم کیا اور یہ انداز و ادا اور استغناء و احسان کیا۔ آپ کا حسن آپ کے پاس ہماری ازلی امانت ہے۔

خامشی میں بھی نکلتی ہے تکلم کی ادا
گرمی گفتار ہی سے رونق محفل نہیں

یہ عنایت یہ کرم یاں لغزشوں پر لغزشیں
ہم انہیں بھولے ہوئے ہیں ہم سے وہ غافل نہیں

قادری سے بے وفائی کر کے کیا شرمایئے
وہ بھی وعدہ کی وفا کا کچھ بہت قائل نہیں

لندن۔ نومبر ۱۹۷۸ء

بات گرچہ عقل و دانش کی توانائی کی ہے
چاند تاروں پر بھی مہر انساں کی خودرائی کی ہے

ہم نے اپنی راہ میں خار مغیلاں بو دیے
کہیئے اب کس کو شکایت آبلہ پائی کی ہے

امتیاز طالب و مطلوب کچھ باقی نہیں
خود تجلی منتظر چشم تماشائی کی ہے

اب تو اہل ہوش تک چاک گریبان کر اٹھے
کیا تصرف کیا کرامت تیرے سودائی کی ہے

جان دیدینا ہمارے واسطے مشکل نہ تھا
لاج رکھنی پر ہمیں انکی مسیحائی کی ہے

ہم سے بھی آداب یوسف دامنی نبھتے نہیں
ان میں بھی کچھ کچھ جھلک شان زلیخائی کی ہے

دل نے ایام فراغت میں بھی کچھ پایا نہیں
کس سبب سے اب شکایت آبلہ پائی کی ہے

مصلحت اندیشیاں وجہ تضاد باطنی
عافیت میں کیفیت ہنگامہ آرائی کی ہے

ہم نے تلوار و قلم دونوں اٹھا کر رکھ دیئے
دھوم سارے شہر میں اب اپنی دانائی کی ہے

کس قدر ہیں یہ اسیر وہم آزادہ روی
محفل زنداں میں کس کو تاب شنوائی کی ہے

کیجئے کس سے شکایت کون سمجھے گا اسے
سب کو تنہائی ہمیں فقدان تنہائی کی ہے

ہم تمہارے دامن دولت سے وابستہ ہوئے
قیصری کی ہے نہ اہمیت نہ دارائی کی ہے

چھوڑیئے بھی ان کے لکھنے کا برا کیا ماننا
قادریؔ صاحب کو عادت خامہ فرسائی کی ہے

۲۴ر ۱۴ دسمبر ۱۹۷۹ء لندن

☆☆☆

جب نظر سے آگے ہے پھر نظر سے پردا کیا
آج ہی تو فردا ہے انتظار فردا کیا

آگہی کی غفلت میں گمرہی ہوئی کیا کیا
عقل تو ہمیں بھی ہے عقل کا بھروسا کیا

ساتھ رہ کے بھی تنہا ہم رہے ہیں بس کیا کیا
بات تو یونہیں سچ ہے آپ سے چھپانا کیا

ہم تو اپنے گھر میں بھی بے گھرے سے رہتے ہیں
ظالموں کی بستی میں ٹھور کیا ٹھکانا کیا

اٹھ کے دیر و مسجد کو جائیں گے نہ دیوانے
جو نہو ترے در پر وہ بھلا ہے سجدا کیا

مرنے والے جیتے ہیں جیتے جی بھی مر جائیں
موت خود تقاضہ ہے موت کا تقاضا کیا

ذہن کے خلاؤں میں جھٹپٹا سا طاری ہے
بے حسوں کی بستی میں شام کیا سویرا کیا

شہر کی فضا ساری عطر سے سم آلودہ
عشق کے شہیدوں کی مدح کیا تبرا کیا

کون سادہ لوحوں کو رمز خسروی سمجھائے
جو ہوا نہ اپنوں کا وہ رہے گا تیرا کیا

یخ بھری ہواؤں سے آگ سی برستی ہے
ہم خود اپنے دشمن ہیں غیر کیا شناسا کیا

قادری کی جاں لے کر مفت میں ہوئے رسوا
اس نے کچھ نہیں کھویا آپ نے بھی پایا کیا

لندن۔ ۱۳ نومبر ۱۹۷۹ء

ہے وہی اک داستاں از ابتدا تا انتہا
وہ بھی شرماتے نہیں ہیں ہم بھی پچھتائیں گے کیا

تھا مرے اشعار میں ویسے بھی ابہام لطیف
تیرے انداز تکلم سے بڑھا یہ سلسلا !

ہم سے ترک راہ و رسم دوستی ممکن نہیں
پھونک کے گھر ہم نے روشن رکھی ہے نار القری ؎

؎ عربوں میں دستور تھا کہ رات کو کسی اونچی جگہ پر آگ روشن کرتے تھے تاکہ مسافر دور سے دیکھ کر آجائے۔ آگ جتنی زیادہ روشن اور بڑی ہوتی تھی وہ شخص اتنا ہی سخی فیاض اور مہمان نواز سمجھا جاتا تھا اس آگ کو نار القری کہتے تھے۔ ۱۲

مصلحت کو دیکھتے ہیں کب ترے شوریدہ سر
سب نے جو چاہا کہا اور ہم نے جو چاہا کیا

کیا کہا کیا سعی لا حاصل سے کچھ حاصل نہیں
ہم نے طوفانوں کی ضد میں بھی جلایا ہے دیا

لے گئے تھے جن کو منزل تک اٹھا کر دوش پر
اپنے حق میں سب کے سب نکلے وہ پیر تسمہ پا

دوسروں سے اپنا خود بار الم اٹھتا نہیں
حال اپنا دوستوں سے کہہ کے ہم پائیں گے کیا

جس کے دم سے ہے یہ رونق جس کے دم سے برکتیں
جب وہی پہنچا دروں پر اس کو دھتکارا گیا[1]

---

[1] حدیث شریف میں ہے کہ کچھ اللہ کے بندے ایسے ہیں کہ الجھے بال پریشان حال جہاں جاتے ہیں دھتکارے جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا یہ مرتبہ ہے کہ اگر کسی بات پر قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ اسے پورا فرما دیتے ہیں۔

ہم نے خود پتھر اٹھا کر دوستوں کو دے دیئے
ایک ہی صف میں کھڑے ہیں غیر کیا کیا آشنا

ہم ہیں مجبور قریحت وہ بدل سکتے نہیں
چھوڑیئے اب ان سے کیا اس کی شکایت کیا گلا

قادری کے آپ آنے کا برا مت مانیئے
ہیں قدم درویش کے سب کے لیے رد بلا

۳۰/۲۹ دسمبر ۱۹۷۹ء
لندن

☆☆☆

برہ کی راتیں دیہہ کی اگنی بادل گھر گھر آئیں گے
ہم بھی ان کو یاد کریں گے وہ بھی بہت پچھتائیں گے

آڑے ترچھے بانکے ٹیڑھے ہو کے باتیں کرتے ہو
ہم دونوں مٹی سے بنے ہیں مٹی میں مل جائیں گے

بندھ کے کنکر ہیروں جیسی مالا کس نے پروئی ہے
جب بندھن ٹوٹے گا زباں کا لفظ بکھرتے جائیں گے

یتری گلی میں جاں دینے کی رسم ہمیں نے زندہ کی
دست تظلم شل ہو گا جب باندھے کفن ہم آئیں گے

ہم تو تنہا طے کر لیں گے رلہ یہ کالے کوسوں کی
آپ کہاں تک ساتھ رہیں گے آپ کہاں تک جائیں گے

ہم بھی چلتے لیکن ہے اس بزم کا اب دستور نیا
دنکو کیسے رلت کہیں گے ' رلت کو دن کہہ پائیں گے

قتل کہاں تک دفن رہے گا کب تک ہو گی چیل چلھور
ساری فضا میں ہو گا تعفن سر پر گدھ لہرائیں گے

جھوٹے سچے وعدے کر کے اپنا بھرم کیوں کھوتے ہو
ہم ایسے بھولے بھی نہیں ہیں باتوں میں آجائیں گے

تاروں کی پتھرائیں آنکھیں پھولوں نے دم توڑ دیا
سونی سیج کی ہر سلوٹ میں ناگ ہی پھن لہرائیں گے

کار جہاں کس نے نمٹایا ، کار جہاں نمٹا ہے کبھی
قادری اپنا رستہ پکڑو تم سے اور بھی آئیں گے

☆☆☆

کوئی کہتا ہے جلا کوئی ہے کہتا نہ جلا
آتش گرمی رفتار سے ویرانہ جلا

ہم نے بھی لعل و جواہر کو اٹھانا چاہا
جل گیا ہاتھ ہمارا یدبیضا نہ جلا

برق خاطف تو بہت بار گری گلشن پر
آشیانے کے سوا ایک بھی تنکا نہ جلا

حسن اور عشق کے اسرار بھلا کیا کہئے
جل گئی شمع مگر ایک پتنگا نہ جلا

فطرت عشق سے روشن ہے شعاع ارنی
جل گیا طور مگر ذوق تماشا نہ جلا

قتل اشجار سے رکتا ہے کہیں سیل بہار
اپنی تفسیدہ تمناؤں کا صحرا نہ جلا

لندن۔ مارچ ۱۹۷۹ء

☆☆☆

اب ہوش ٹھکانے ہیں اپنے اب وحشت غم بھی دور ہوئی
اب کوئی طلب باقی نہ رہی، مجبوری دل منظور ہوئی

اس ترک تعلق کے دعوے پر ہم سے شکایت کیا معنی
یہ کم نگہی یہ کج کلہی اب عشق کا بھی دستور ہوئی

جو دل پہ بنی ہم پر بیتی چپ چاپ سہی خاموش رہے
ہم تیری شکایت کیا کرتے تو بھی تو بہت مجبور ہوئی

یہ ماہ نوردی انساں کی ناکامی انسانیت ہے
آکاش تو پہلے دور ہی تھا اب آج میں بھی دور ہوئی

زخموں کے چراغاں خوں کی شفق اور اہل جنوں کی گلکاری
پھر کس نے کہا یہ راہ طلب بے کیف ہوئی بے نور ہوئی

تقدیر کو جو چاہے کہہ لو، تدبیر کوئی جاگیر نہیں
کیا قافلہ اہل دل کا بس ناکامی مقدور ہوئی

یہ رنگ شفق' یہ نور سحر' یہ کاذب و صادق کے دھوکے
یاں مہر تمنا کب ابھرا یاں ظلمت شب کب دور ہوئی

کلیوں کے دریچے وا نہوئے کیا نکہت گل محبوس ہوئی
زہراب کے دو اک چھینٹوں سے شعلوں کی لپک کب دور ہوئی

افلاک کے پردے چاک ہوئے پھولوں کی قبائیں سل نہ سکیں
انسان کی بالا دستی سے انسانیت مقہور ہوئی

کیا وصل کہاں کا ہجر یہ ہیں کیفیت ذہنی کے پردے
وہ راحت جاں وہ روح درداں کیا پاس ہوئی کیا دور ہوئی

علموں کے کفن کفنوں کے علم ہر سمت ہجوم نظارہ
پھر شہر ستم کا ہر کوچہ ہر ایک گلی معمور ہوئی

اس شہر نگاراں میں ہم سے ہے سب کو تغافل کا شکوہ
کب کوہ ندا کے دیوانوں سے منزل جاں مستور ہوئی

جب ہجر کی لو سے یادوں کے سوکھے ہوئے پتے پھیل گئے
پھر شکوے کا کیا موقع ہے رنجش بھی دل سے دور ہوئی

برسات کی بھیگی راتوں میں چوٹوں کے ابھر آتے ہیں نشاں
ہم یاد کے اپنی گھایل ہیں کس بات پہ تو مغرور ہوئی

معراج کمال قدوسی آغاز شعور انساں ہے
کیا کوئی حقیقت تجریدی الفاظ میں بھی محصور ہوئی؟

یہ لطف نمایاں بھی ان کا اک پردہ جور پنہاں ہے
جو تیر لگا وہ پار ہوا جو بات ہوئی بھرپور ہوئی

پہنچا بھی نہ تھا لب تک اپنے ہاتھوں سے گرا اور ٹوٹ گیا
گو دل کی طلب باقی ہے وہی نظروں کی شکایت دور ہوئی

یہ غنچہ لبی یہ سیم بری یہ سیم و جواہر کے رشتے
سب درد کے ناتے ٹوٹ گئے آنکھوں کی شفق بھی دور ہوئی

(لندن)

ہجر کی بات یا وصال کی بات
دل نے پھر کی ترے ملال کی بات

مر مٹے اہل حال لب نہ کھلے
حرف منصور صرف قال کی بات

اس کو تشبیہ کا ہے سے دیجے
کیجئے کیسے بے مثال کی بات

تم کو بھی زعم جاں سپاری تھا
ہے ابھی صرف پارسال کی بات

نور و نکہت سے بھر گئی دنیا
چھڑ گئی تھی ترے جمال کی بات

☆☆☆

مطلع ثانی

ہجر اور وصل ہے خیال کی بات
یہ شب وروز و ماہ سال کی بات

مشکل انکار حسن کو ہو مگر
سخت ہے عشق پر سوال کی بات

کیسے ہر راہبر کے ساتھ چلیں
بے سروں سے ہو کیسے تال کی بات

وہ کہاں اور حرف تلخ کہاں
تم نے کی ہو گی اشتعال کی بات

بورژوائی ہیں سادہ دل بندے
مارکسیت ہے قیل و قال کی بات

قادری جی رہا ہے تیرے بغیر
ہے مگر یہ بہت کمال کی بات

☆☆☆

مرے رب رحم کیجئے میرے اوپر
میں ان حالات سے تنگ آ گیا ہوں

ملا کیا روز روشن میں جو کہئے
اندھیری رات سے تنگ آ گیا ہوں

خود آگاہی بھی ہے اک آزمائش
میں اپنی ذات سے تنگ آ گیا ہوں

چٹخ جائے زمیں ایسی ہو خشکی !
بھری برسات سے تنگ آ گیا ہوں

کرو اب مختصر غم کی حکایت
میں لمبی بات سے تنگ آ گیا ہوں

ہے دل کو قید تنہائی کی عادت
حسیں لمحات سے تنگ آ گیا ہوں

یہ در پردہ سراسر برکتیں ہیں
میں جن آفات سے تنگ آ گیا ہوں

نظر چٹیل مناظر ڈھونڈتی ہے
گھنے باغات سے تنگ آ گیا ہوں

اڑا دو سر بجرم بے گناہی
ان الزامات سے تنگ آ گیا ہوں

نہ پوجوں خود تراشیدہ صنم کیوں
منات و لات سے تنگ آ گیا ہوں

کبھی تو اتفاقاً جیت بھی ہو
مسلسل مات سے تنگ آ گیا ہوں

لندن۔ ۷ جنوری ۱۹۷۷ء

☆☆☆

دشمن جاں تھے جنہیں ہم جان جاں سمجھا کئے
تھے وہی رہزن جنھیں سب پاسباں سمجھا کئے

قید و آزادی میں ایام خزاں کی فرق کیا
ہم بھی دانستہ قفس کو آشیاں سمجھا کئے

کہہ دیا تھا بستہ لب غنچے جلا دیں گے چمن
لوگ اس کو بھی مرا حسن بیاں سمجھا کئے

خود ہی اپنے نفس نے کھایا فریب اتقا
کیف یک روزہ کو عیش جاوداں سمجھا کئے

سوز محنت کش سے شاہوں کے سنگھاسن جل گئے
تھی حقیقت آپ اس کو داستاں سمجھا کئے

درحقیقت تھا فقط پنڈاریوں کا قافلہ
یار اس کو دوستوں کا کارواں سمجھا کئے

وہ بھی اپنی طرح کا ایک شخص نامعقول تھا
سادگی میں جس کو ہم جانِ جہاں سمجھا کیے

خود ہی بے عقلی سے گلشن میں گلوں کی گل کھلے
وہ سراسر آگ تھی جس کو دھواں سمجھا کیے

ہم اگر ٹھہرے کبھی تو رک گئی کل کائنات
التباس دید کو دورِ جہاں سمجھا کیے

لوگ سمجھے ہے مرے اشعار میں بھی ان پہ طنز
ہم کہ گردکارواں کو کارواں سمجھا کئے

لغزشوں پر میری انکا عفو آمیز التفات
انکی نظروں کا ہم انداز فغاں سمجھا کئے

اختلاف لفظ و معنی غیر کی ایجاد ہے
ہم زبان یار کو اپنی زباں سمجھا کئے

ہر گلی کوچے میں زیر خرقہ ہائے تار تار
ڈھونڈتے پھرتے تھے ان کو وہ کہاں سمجھا کئے

ظلم ہے سم مسلّع خوف کا آئینہ دار؎
شیر قالیں خود کو گو چنگیز خاں سمجھا کئے

قرب شاہاں خواہ تہذیبی و تادیبی ہی ہو
تیرے دیوانے تو اس کو بھی زیاں سمجھا کئے

ہم نے دیکھا قادرؔی کے غم کا انکو غم نہ تھا
جن کے غم کو حاصل عمر رواں سمجھا کئے

۲۶ دسمبر ۱۹۷۹ء

☆☆☆

؎ سم مسلع ۔ زہر قاتل

اب بھی آ جاؤ رمق باقی ہے
ڈھل چکی دھوپ شفق باقی ہے

آشیاں اور قفس خاک ہوئے
اک دھواں تا بہ افق[ے] باقی ہے

انقلابوں کی کتھا ختم ہوئی
آخری ایک ورق باقی ہے

ے افق کا صحیح تلفظ ف کے پیش سے ہے۔ یہاں ف کے زبر سے باندھا گیا ہے۔

حال دل شقشقہ شیطاں ہے
اک یہی لفظ ادق باقی ہے

ہے شہیدوں کے لہو کی سرخی
کون کہتا ہے شفق باقی ہے

ے شقشقہ۔ بلبلاہٹ کے عالم میں اونٹ کے منہ سے نکلے ہوتے جھاگ کو کہتے میں اس لیے فضول گفتگو۔ یاوہ گوئی کو بھی کہنے لگے۔ عربی میں بے ہودہ بے معنی باتیں کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ بہت زیادہ بکواس کو بھی۔ ذو شقشقہ عربی میں باتونی اور بکی شخص کو کہتے ہیں۔

رات نے اپنے سمیٹے نہیں پر
دور ہے صبحِ غسق ؎ باقی ہے

دھوپ امید کی کمھلا بھی گئی
آرزوؤں کی شفق باقی ہے

کچھ جفا اور وفا یاد نہیں
ہاں مگر دل کا قلق باقی ہے

قادری کم ہیں غزل کے دشمن
کفر باطل ہوا حق باقی ہے

☆☆☆

؎ غسق رات کے صرف شروع حصہ کو نہیں کہتے۔ اس کے معنی رات کے ابتدائی اندھیرے کے بھی ہیں صرف تاریکی اور اندھیرے کے بھی اور سیاہی کے بھی۔ کہتے ہیں (اَغسَقَ اَلرَّجلُ) آدمی رات کے اندھیرے میں آیا۔

ہم نے مانا کہ ترے درد کا رشتا ٹوٹا
ہاں مگر اک خلش جاں سے بھی پیچھا چھوٹا

خود ہمیں فرصت امروز نہیں ہے باقی
کون کہتا ہے ترا وعدہ فردا جھوٹا

کون زنداں سے مع طوق و سلاسل نکلا
کس کی تعبیر سے پھر خواب زلیخا ٹوٹا

تجھ کو ہم مانگ کے پھر اور طلب کیا کرتے
ماسوا تیرے تھا ہر ایک سہارا جھوٹا

کون جانے کہ پس پردہ تدبیر ہے کون
جور مزدور سے افسون تماشا ٹوٹا

ہم کو اس راہ میں اک نازش گمراہی ہے
قصہ معصیت آدم و حوا جھوٹاؔ

ؔ پولینڈ کے حالیہ واقعات کے پس منظر میں (۱۹۸۲)

ؔ یہاں قصہ آدم و حوا کو جھوٹا نہیں کہا اس واقعہ کو معصیت اور گناہ سے تعبیر کرنے کو غلط و دروغ سے تعبیر کیا ہے۔ معصیت نہیں سہو۔

امتحاں کیا ' زدہ جف قلم ہیں دونوں
ہیر[1] سرگشتہ و حیراں ہے رانجھا جھوٹا

---

[1] جف قلم۔ مشہور حدیث شریف میں یہ الفاظ آئے ہیں۔ بخاری شریف کے باب القدر میں دو جگہ بیان ہوئی ہے ایک اور تفصیلی حدیث شریف میں ہے جفت الاقلام ورفعت الصحف (قلم خشک ہوگئے اور دفتر اٹھالیے گئے) یعنی جو کچھ تقدیر میں لکھا جانا تھا لکھ دیا گیا۔ اب قلم خشک ہوگئے اور صحیفے اٹھادیئے گئے۔ ہر شخص کا مقدر معین ہوگیا۔ زدہ جف قلم ہیں دونوں یعنی دونوں اپنی اپنی تقدیر کے لکھے کو پورا کر رہے ہیں کوئی کسی دوسرے پر الزام نہیں رکھ نہیں سکتا۔ امتحان کس کا اور آزمائش کیسی۔ اگر رانجھا کہے کہ ہیر نے بے اعتنائی و ظلم کیا تو جھوٹا ہے اور ہیر و رانجھا بھی محض استعارے ہیں۔

خضرو موسیٰ نہ سہی ، شاہ کی بیگار تو تھی
اب لیے بیٹھے ہیں ساحل پہ سفینا ٹوٹا

ے حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعات سورہ کہف میں بیان ہوئے ہیں (الکھف سورہ ۱۸۔ آیات ۷۱۔ ۷۴۔ ۸۹)
حضرت خضر کے ساتھ حضرت موسیٰ ہم سفر ہوتے ہیں ایک جگہ کشتی میں سوار ہوئے تو حضرت خضر نے اس کشتی میں سوراخ کر کے اسے ناکارہ بنادیا اسی طرح چند واقعات خلاف توقع دیکھ کر (جس کی مصلحت بظاہر محسوس نہ ہوتی تھی) حضرت موسیٰ کو تعجب ہوا۔ بعد میں ھذا فراق بینی و بینک (یہاں سے ہماری تمہاری راہیں الگ ہو جاتی ہیں) کہتے وقت حضرت خضر ان اقدامات کی مصلحتیں بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ کشتی دو غریبوں کی تھی جنکے والدین معذور و ضعیف ہیں اور اس کشتی کی آمدنی پر انکا گذارا ہے۔ شاہ وقت نے اس دن تمام کشتیوں کو بیگار میں پکڑنے کا حکم دے دیا تھا اس کشتی میں سوراخ کرنے کی مصلحت یہ تھی کہ اسے ناکارہ سمجھ کر شاہی پیادے چھوڑ دیں گے اور وہ لڑکے اپنی روزی کما سکیں گے۔ شعر میں یہ واقعہ تلمیحا ہی نہیں استعارۃ بھی بیان ہوا ہے اور انسانی زندگی کے عمومی واقعات پر منطبق ہوتا ہے۔

کس کی نظروں سے امیدوں کے بھنور جاگ اٹھے
دور تاریک فضا میں کوئی تارا ٹوٹا!

یاد ہے گرمیِ شب، جسم کی مرطوب مہک
بھیگی بھیگی سی جبیں جس سے پسینا پھوٹا

قادریؔ کہتے ہو اب اس سے تعلق ہی نہیں
اک تمہیں سچے ہو اور سارا زمانہ جھوٹا

لندن۔ ۲ جنوری ۱۹۸۲ء

خسروی نے جو یہاں زمزمہ پرداز نہ تھی
بلبل ہند بھی اتنی تو خوش آواز نہ تھی

ہم نے سوچا تھا کہ صیاد کا رہ جائے بھرم
سب نے سمجھا کہ ہمیں طاقت پرواز نہ تھی

سرخیاں میرے لہو کی نہ لگی تھیں جب تک
داستاں جور کی اتنی بھی خوش آغاز نہ تھی

جاں سپاری کی حکایت پہ یہ حیرت کیسی
بات گو عام نہ ہو تم سے تو کچھ راز نہ تھی

پاترائی سے زیادہ نہ تھا دنیا میں قیام ؎
گو تفاؤل کے لیے بھی تو ہمیں ساز نہ تھی

؎ بعض لوگ جب سفر کرتے تھے تو پہلے فال نکالتے جس دن سفر کرنا ہوتا وہ سعد نہ نکلتا تو سامان سفر یا اس میں سے کچھ ایک دن پہلے کسی اور جگہ بھیج دیتے گویا اس دن سفر کی ابتداء ہو گئی۔ اب جس دن جانا ہے وہاں جا کر آگے چل دیں گے اس کو پاتراب کرنا یا پاتراب ہونا کہتے تھے عمل کو پاترائی کہا گیا ہے۔

گرچہ تھے نقش قدم سجدہ سر سے پہلے
ہم نہ تھے جب تو گلی تیری سرافراز نہ تھی

آج تو غیر بھی سرگشتہ و درماندہ ہے
تیری آوارہ نگاہی غلط انداز نہ تھی

ہم ہیں مارے ہوئے بیداد طلب کے ورنہ
حسن کو اتنی کبھی جرات اغماز نہ تھی

آیت عشق ہے توجیہہ صنم خانے کی؂
شرح تقدیس حرم تفرقہ پرداز نہ تھی

؂ دنیا کو صنم خانہ اور نگار خانہ بھی کہتے ہیں۔ تخلیق کائنات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ساتھ اس کی محبت وربوبیت اور شفقت بھی شامل ہے۔ الخلق عیال اللہ) مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ واللہ روف با العباد ۔اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مادر مشفقہ سے زیادہ مہربان اور ان سے محبت کرنے والا ہے کائنات کے ذرہ ذرہ سے اس کی محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ اسلام اللہ تعالیٰ کی اس عالمی محبت کا نقیب ہے اور محبت ہی تخلیق کائنات کی توجیہ ہے۔ خانہ کعبہ بھی بہ اوقات مختلفہ اصنام باطل کا مستقر رہ چکا ہے لیکن تقدیس کا سرچشمہ وہی محبت الٰہیہ ہے جو اس کی تعمیر کرتے وقت حضرت سیدنا ابراہیم کی دعا میں ظاہر ہوئی ہے۔ اس لیے مذہب افتراق اور اختلاف کی بنیاد نہیں۔ تفرقہ پردازی اللہ اور اس کے دین سے نہیں کفر اور اس کے متبعین کی روش سے پیدا ہوتی ہے۔

وہم سا مجھ کو کوئی وقت دعا گزرا تھا
وہ ترے دل کے دھڑکنے کی تو آواز نہ تھی

مصلحت باختہ قادرؔی بے غم کو
فرصت یک نگہ عشق خرد ساز نہ تھی

لندن۔ یکم جنوری ۱۹۸۲ء

☆☆☆

درد بجاتے ہیں اور دل نہیں رہنے دیتے
وہ کبھی یاد سے غافل نہیں رہنے دیتے

اختتام سفر اک تفرقہ سامانی ہے
کارواں کو سر منزل نہیں رہنے دیتے

ہم کہ گھایل نگہ یک غلط انداز کے ہیں
شہر میں بھی کوئی قاتل نہیں رہنے دیتے

فیض صحبت سے عطا کرتے ہیں آداب یقیںؔ
پھر کسی بات کا قائل نہیں رہنے دیتے

ؔ فیض صحبت سے عطا کرتے ہیں آداب یقیں اور پھر کسی بات کا قائل نہیں رہنے دیتے قلب سے وساوس واوہام کا زنگ جب دور ہو جاتا ہے تو وہ ایقان سے بھر جاتا ہے انسان پر علوم باطنی کے دروازے کھلتے ہیں تو نظروں سے حجابات دور ہو جاتے ہیں۔ سب سے بڑا حجاب علم ہے۔ العلم حجاب اکبر لیکن یہ سب توفیق ایزدی اور اولیا اللہ کے فیض صحبت سے ہوتا ہے اس بات کو ایک واقعہ سے سمجھا جاسکتا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء (سلطان جی) حضرت شیخ بابا فرید گنج شکر

خضر اور شہ سے بچے گر تو جلا دیں ہم خود
کوئی کشتی لب ساحل نہیں رہنے دیتے

دور کر دیتے ہیں نظروں سے حجاب اکبر
مکتب عشق میں جاہل نہیں رہنے دیتے

رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری سے پہلے تمام علوم کی تکمیل کر چکے تھے۔ علوم متداولہ میں ثانی نہیں رکھتے تھے اور علم بحث و مناظرہ میں اس درجہ کمال پایا تھا کہ ہم عصر علما انہیں محفل شکن اور مولانا بحاث کہتے تھے کہ جس علمی مسئلے پر لب کشائی فرماتے دوسروں کو یارائے گفتگو نہ رہتا اور میدان چھوڑ کر چلے جاتے بلند آہنگ دعوے کرنے والوں کی محفلیں درہم برہم ہو جاتیں لیکن جب اپنے شیخ کے حضور پہنچے تو فیض صحبت نے سب کچھ بدل دیا۔

شیخ کبیر (حضرت بابا صاحب گنج شکر) نے سلطان جی (حضرت نظام الدین اولیاء) کو ایک دعا سکھائی۔ پوچھا اب سناؤ سنانے لگے۔ ایک لفظ کے اعراب میں شیخ کبیر نے اصلاح فرمائی۔

(سلطان جی) فرماتے ہیں کہ جو اعراب میں نے پڑھا تھا ہم معنی داشت (میں نے جس طرح پڑھا تھا وہ بھی بامعنی تھا) یہ تو انکا نحوی علم تھا جس سے دست بردار ہو چکے تھے۔ پس ہم چناں کہ شیخ فرمود خواندم (پھر جس طرح شیخ نے فرمایا ویسے ہی میں نے سنایا۔ شیخ نے دوبارہ سنانے کا حکم دیا۔ دعا سنائی گئی۔
واں شیخ فرمودہ بود ہم چناں نخواندم
(پھر جس طرح شیخ نے فرمایا تھا بالکل اسی طرح میں نے سنایا)۔

بے طلب، غیر توقع بھی وہ یوں دیتے ہیں
شکوہ دامن سائل نہیں رہنے دیتے

قادریؔ طالب عرفاں کی نیاز آگینی
نقش پا بھی سر منزل نہیں رہنے دیتے

لندن۔۱۰جنوری ۱۹۸۶ء

☆☆☆

حجرہ سے باہر ان کے ساتھی دوست اور پیر بھائی مولانا بدرالدین اسحاق بیٹھے تھے انہوں نے سلطان جی سے فرمایا: نیکو کردی کہ ایں اعراب ہم چناں خواندی کہ شیخ فرمودہ بود (بہت اچھا کیا یہ اعراب اسی طرح پڑھے جس طرح شیخ نے فرمایا تھا) سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء نے جواب دیا:

اگر سیبویہ کہ واضع ایں علم (نحو) ست وآں دیگراں کہ بانی ایں قواعد بودند بیایند مرا بگویند کہ اعراب ہم چناں نیست کہ می خواندی۔ من ہم چناں خوانم کہ شیخ فرمود۔

اگر سیبویہ کہ جس نے یہ سارا علم نحو اور قواعد صرف ایجاد کیے ہیں اور اسی طرح کے دوسرے علمائے صرف و نحو بھی اٹھ کر میرے سامنے آجائیں اور مجھ سے کہیں کہ جس طرح تم نے اعراب پڑھے ہیں اس طرح صحیح نہیں ہیں۔ اس کے باوجود میں اسی طرح پڑھوں گا جس طرح میرے شیخ نے حکم دیا ہے!

(منقول از ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم۔ سید مناظر احسن گیلانی)

غنچہ و گل کا قتل عام کیا
خوب گلشن کا انتظام کیا

سب سے جھک کر ملے کڑی نہ سنی
بس مروت کا التزام کیا

دل کو اب فرصت نظر نہ رہی
اس نے دیدار اپنا عام کیا

ہم کہاں اور ترک عشق کہاں
آپ نے کیا خیال خام کیا

اللہ اکبر! یہ ہیں آداب یقیں ؎

وہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

یہ صرف فیض صحبت سے حاصل ہوتے ہیں اور ان مراتب اور درجات کی کوئی حد نہیں اسے جانیں جاننے والے ہی۔

حضرت سیدنا مولا علی فرماتے ہیں لو کشف العطاء لماز دت یقینا (اب اگر نظروں سے پردے اٹھ بھی جائیں تو بھی یقین میں اضافہ نہ ہو گا) یہ ایقانکا بلند ترین درجہ ہے۔

سانپ سونگھی ہے قلب کی ہستی؎
آرزوؤں نے ازدحام کیا

کل سرِ راہ وہ پڑے تھے نظر
ہم نے بھی دور سے سلام کیا

لندن۔۱۸ مئی ۱۹۷۷ء ۔ ۲۴ مارچ ۱۹۸۴ء

☆☆☆

؎ محاورہ ہے فلاں چیز سانپ سونگھی ہے یعنی فلاں شے زبردست کی ملکیت ہے کوئی دوسرا اس پر تصرف نہیں کر سکتا سانپ نے سونگھ لی تو اور کوئی اس کے قریب نہیں جا سکتا۔ سلیم بطور تفاول اس کو کہتے ہیں جسے سانپ نے ڈسا ہو کلام پاک میں ہے الا من اتی اللہ بقلب سلیم۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ قلب سلیم وہ قلب جسے اللہ تعالیٰ کی محبت کے سانپ نے ڈسا ہو۔ کتاب عشق میں آرزو کا باب الحاقی ہے۔ انتا کہ مومن خاں کہتے ہیں

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال دیں ۔۔۔ مومن نہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

آؤ ہم مل کر جمال یار کی باتیں کریں
اپنے غم بھولیں غم اغیار کی باتیں کریں

وادیٔ سینا کی یا ہردوار کی باتیں کریں
جگ کے سرجن ہار، پالن ہار کی باتیں کریں

ے وادی سینا کی یا ہردوار کی باتیں کریں۔
مولانا سید مناظر احسن گیلانی' ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت میں (صفحہ ۶۹۔۷۰) حاشیہ پر لکھتے ہیں۔

میں نے اپنے دیوبندی اساتذہ سے جن کا نام صحیح طور پر اس وقت محفوظ نہ رہا یہ بھی سنا ہے کہ دیوبند کے سابق صدر مدرس حضرت مونا محمد یعقوب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ یعنی حکیم الامت رحمتہ اللہ علیہ کے استاد امام جو اپنے کشفی بیانات میں جماعت دیوبند میں خاص امتیاز رکھتے تھے کبھی کبھی یہ فرماتے تھے کہ ہردوار (ہر بمعنی خدا' دوار، گھر بیت یعنی بیت اللہ) میں ہر کی پیڑی کے نام سے جو مقام موسوم ہے مجھے اس میں ایک لاہوتی نسبت محسوس ہوتی ہے۔

تابہ کے طوق و رسن کی دار کی باتیں کریں
چھوڑو ان قصوں کو ہم اشعار کی باتیں کریں

تحفہ درویش کیا ہے ماسوائے برگ سبز
شیخ صاحب خرقہ و دستار کی باتیں کریں

سب وہی مفہوم ہیں ایہام لفظی ہے فقط
اشتراکیت میں عہد زار کی باتیں کریں

خود نہیں اپنی سمجھتا میری کیا سمجھے گا وہ
رند سے کیوں خواہ مخواہ بیکار کی باتیں کریں

دوستوں سے جاں فروشی کا صلہ پایا نہیں
دشمنوں سے تابہ کے پیکار کی باتیں کریں

چلچلاتی دھوپ، تپتا صحن، سوتے بام و در
آؤ ہم بھی طالعِ بیدار کی باتیں کریں!

شہر کس کا؟ ہم تو کچھ واقف نہیں، ہے کون شخص
کیا سبب، کیوں کوچہ و بازار کی باتیں کریں

آنے جانے سے تیرے بنتا بگڑتا کچھ نہیں
جیت بھی جائیں اگر تو ہار کی باتیں کریں

دوبئی ۱۹ـ۱۷ اپریل ۱۹۸۲ء

ورد جاں ہم نے تیرا نام کیا
بس یہی کام صبح شام کیا

چند ہلکے سے خوں کے چھینٹوں نے
ریگ زاروں کو لالہ فام کیا

کیا سلام و دعا صنم سے رہے
دور سے ہم نے رام رام کیا

اس نے دوبارہ اک نظر بھی نہ کی
دل نے کیا کیا خیال خام کیا

ہم نے ترک کلام کے باوصف
راہ میں جب ملے سلام کیا

دل سے اب ترک ترک، ترک ہوا
عشق نے فائز المرام کیا

اک نظر قادرؔی کو دیکھ لیا
کیسے آزاد کو غلام کیا

لندن۔ ۱۸ مئی ۱۹۷۷ء ۲۴ مارچ ۱۹۸۲ء

☆☆☆

کیا کرے گا اگر آیا بھی یہاں عزرائیل
قلب کے گرد کھنچی ہے تری یادوں کی فصیل

کم نگاہی میں تری شان دل آویزی ہے
زہر بھی انگبیں آسا ہے بمقدار قلیل

واعظ و وعظ سر کوہ کا افسوں باطل
قوم برگشتہ پے کار صلیب و انجیل

حسن محتاج اثر، تابع تعبیر و طلب
عشق کے باب میں ہے کوئی نہ حجت نہ دلیل

حسن کی خود طلبی دافع حب آفل؎
طبع آزاد پہ کچھ سہل نہ تھا بار خلیل

؎ انسان پابندیوں سے گریزاں اور فطرتاً طبع آزاد رکھتا ہے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو بطور خود صحیح راہ تلاش کرنی تھی اور اپنے آباؤ اجداد کے تراشیدہ اصنام کو شکست کرنا تھا۔ شکست و ریخت آسان عمل ہے لیکن تعمیر و تلاش حق آسان نہیں معبودان باطل کے ہجوم میں معبود حقیقی کا عرفان و تلاش اور اس کی ذمہ داری کو بار خلیل سے تعبیر کیا ہے اور بشری تقاضوں کے پیش نظر طبع آزاد پر یہ بار سہل نہ تھا لیکن حضرت خلیل نے لااحب الاٰفلین فرما کر اس بار کو بھی اٹھالیا اور حب آفل کو بھی رد فرمادیا۔ یہ سب اس محبوب حقیقی کے حسن کی خود طلبی تھی خود چاہتا تھا کہ اس کی ستائش حمد و ثنا پرستش و عبادت اور محبت و محبوبیت سامنے آئے۔

تق کلیجہ بھی جگر تشنہ دیدار کا ہے
ہے تمازت بھی سوا نیزے کی یاں ظل ظلیل

ہر روایت ہی تو پہنچی ترے دیوانے تک!
عشق کے باب میں ہوتی نہیں جرح و تعدیل

تیری مغموم نگاہی تری بیگانہ وشی
دل نے چاہا بھی مگر کر نہ سکا کچھ تاویل

قادری گم شدہ راحت خواب منزل
ہم سفر بھول چکے ہیں اثر بانگ رحیل

لندن۔ ۱۵ مارچ ۱۹۸۲ء

☆☆☆

کس نے پہنچایا خوش جمالوں میں
گم تھا میں دوسرے خیالوں میں

فلسفی کھو گئے مثالوں میں
مکڑیاں پھنس گئی ہیں جالوں میں

غفلت و آگہی کے پردے ہیں
ہیں جوابات گم سوالوں میں

ہم نہ شیطان بن سکے نہ ولی
ہم نہ گوروں میں ہیں نہ کالوں میں

علم تشکیک کا نہیں قیدی؎
ہے یہ شبہات کے ازالوں میں

؎ بعض حلقوں میں یہ خیال عام ہے کہ تشکک اور تذبذب بڑے علم و فضل بڑی عقل و دانش کا ثبوت ہے۔ مغرب کے خامکار متشککین اور ناپختہ فہم و فکر کے حاملین نے اس نظریہ کو خوب ہوا دی ہے اور مشرق کے متبعین نے آنکھ بند کر کے پیروی کی ہے حالانکہ عقلی علمی اور منطقی طور پر ایقان، وہم و گمان اور تشکیک سے بدرجہاں بلند ہی نہیں ایمان سے بھی بہتر ہے۔ موقنین مومنین سے برتر ہیں بعض مفکرین کی تحریروں میں بڑی تمکنت سے بیان ہوا ہے کہ ہم نے اپنا سفر تشکیک سے شروع کیا یا بڑے سے بڑے مسئلہ میں بھی کہ دیا کہ ہاں ہو سکتا ہے یوں بھی مگر ہمیں شک ہے اور سمجھ لیا کہ بڑے تعقل و تفکر کا اظہار ہو گیا یہ علم اور شخصیت دونوں کی خامکاری کی دلیل ہے نہ علم سے تشکیک پیدا ہوتی ہے نہ تشکیک سے علم۔

منزلیں پا گئے دھندلکوں میں
گو بھٹکتے پھرے اجالوں میں

حسن بے عذر و بے جواب ہی تھا
رہ گئے خود ہمیں سوالوں میں

نام سنتے ہی جو بھڑک جائیں
ایسی وحشت کہاں غزالوں میں

قادریؔ دل کے داغ دھل نہ سکے
مدرسوں، میکدوں، شوالوں میں

دوبئی۔ ۱۹ اپریل ۱۹۸۲ء

☆☆☆

عقل و بے عقلی کا جو بھی کچھ تھا وہ موسم گیا
زہر خندگل گیا اور گریہ شبنم گیا

مصلحت اندیشیاں، ناعاقبت اندیشیاں
اپنا ہر داغ الم بے منت مرہم گیا

نام سن کر اس طرح دیکھا کہ دیکھا ہی نہیں
کون خاموشی سے پھر بادیدہ پرنم گیا

راہبر خود راستوں کے پیچ و خم میں کھوگئے
اتفاقاً بھی تو منزل تک کوئی کم کم گیا

تھا کسی قلب سکوں نا آشنا کا پیچ و تاب
اب کہاں زلف دوتا کا سارا پیچ و خم گیا

سرفروشی کو ملی کس سے دل آویزی کی شان
کون سوئے دار لہراتا ہوا پرچم گیا

حاصل نقد دو عالم وعدہ فردا سے کم
دل سے ہر سعی طلب کا سب سرور و غم گیا

میکدہ آشام ظرف بے حقیقت کیا کرے
ہم بلا نوشوں کے جی سے رعب جام جم گیا

اک نظر بیگانہ وش تمہید صد افسانہ تھی
قادرؔی اس کی گلی میں جان کر کم کم گیا

لندن۔ ۶ جنوری ۱۹۸۲ء

حسین اور بھی ہیں میرے دلربا کے سوا
مگر ہے اس میں خدا جانے کیا ادا کے سوا

حدیث شوق نہیں حرف آشنا کے سوا
ہمارے پاس نہیں کچھ بھی اک دعا کے سوا

نشان عظمت و تقدیس آدم خاکی
حرم کچھ اور بھی ہے خانہ خدا کے سوا

ہمارے خون کے دھبوں کے ہیں نشاں باقی
بہار کچھ نہیں رنگینی فضا کے سوا

کسے ہو جرات بے باکی نظر ہے اسے
خود اعتمادی غض بصر حیا کے سوا

ہیں فاصلے بھی تمنائے قرب بھی لیکن
جفا بھی کیا ہے اگر سوچیے وفا کے سوا

نگاہ لطف نہیں کافی قادرؔی کے لیے
دعا بھی لوگ کیا کرتے ہیں دوا کے سوا

لندن۔ ۲۰ مارچ ۱۹۸۲ء

☆☆☆

ہم ہوئے کہہ کے شرمسار بہت
بات گزری ہے ناگوار بہت

کیا ہوا اک مسیح زیر صلیب
کاندھے اپنے بھی ہیں فگار بہت

دل کو دیتے رہے ہیں خود دھوکے
ہم نے اپنے ہی کھائے وار بہت

اتنا آساں نہ تھا بھلا دینا
کھو کے پچھتائے ہم کو یار بہت

خوبیوں کو سراہتے کم ہیں
ٹوکنے والے بے شمار بہت

غیر کو عمر جاوداں دیجو
ہم کو ہے عمر مستعار بہت

کھو دیا ہم نے جان کر تجھ کو
یوں ہمیں بھی تھا اختیار بہت

نام محفل میں بے لیے بھی مرا
پوچھتے تھے وہ بار بار بہت

کام آیا مرے یہ قلب سلیم[1]
حسن تھا یاں خرد شکار بہت

ہم رہے منتظر سر راہے
اس طرف سے گئے سوار بہت

---

[1] سلیم بطور تفاول اس کو کہتے ہیں جسے سانپ نے ڈسا ہو۔ کلام پاک میں ہے الا من اتی اللہ بقلب سلیم۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ قلب سلیم وہ قلب ہے جسے اللہ تعالیٰ کی محبت کے سانپ نے ڈسا ہو۔

تیری آنکھوں سے ان کو کیا نسبت
چشم آہو تو ہے گنوار بہت

ہم نے دیوانہ پن کو اپنایا
تھے یہاں لوگ ہوشیار بہت

کیا خبر اس نے کیوں ہمیں تاکا
یوں تو جنگل میں تھا شکار بہت

مرنے والا تھا تجھ پہ اک خالدؔ
چاہنے والے بے شمار بہت

(لندن)

☆☆☆

انکی نظروں سے ملی داد فغاں سے پہلے
قلب بیدار دیا ہم کو زباں سے پہلے

اور بھی آئے ہیں عقال یہاں مارکس کے بعد
جیسے گزرے ہیں حسین نور جہاں سے پہلے

جھوٹ اور سچ کو تو پھر دیکھیں گے پہلے یہ کہیں
آپ نے بات سنی ہے یہ کہاں سے پہلے

اس کو بھی اک ترا انداز تغافل جانا
بات کا میری سمجھنا وہ بیاں سے پہلے

رند اور شیخ کی باتوں میں وہ کیسے الجھیں
جن کو ایقان ملا وہم و گماں سے پہلے

کیا توقع کبھی گلشن میں بہار آنے کی
بجلیاں کوندتی پھرتی ہیں خزاں سے پہلے

اب جو بچھڑیں تو خدا جانے ملیں یا نہ ملیں
سجدہ شکر تو کر ہی لیں اذاں سے پہلے

لندن۔ جنوری ۱۹۸۰ء